افسانہ لکھ رہی ہوں

فلم ایکٹریسوں کے افسانے

(خوشباش بی۔ اے نے ترتیب دئے)

شمع بک ڈپو۔ دہلی

مطبوعہ پنجاب نیشنل پریس۔ دہلی

جملہ حقوق طبع ونقل وترجمہ بحق پبلشر محفوظ ہیں
کسی افسانے، ملاقات، یا کتاب کے کسی
حصّے کی اشاعت، ترجمہ یا کسی بھی طرح
استعمال سے پہلے پبلشر کی تحریری اجازت
لینی ضروری ہے، لیکن تنقید کے وقت
کچھ حصّوں کو نقل کیا جا سکتا ہے۔

پہلا ایڈیشن

پہلی بار　　مئی ۱۹۵۱　　دو ہزار

اس کتاب کے تمام افسانوں کے کردار،
مقامات، واقعات اور ادارے فرضی ہیں اور
ان کا کسی شخص، جگہ، واقعہ یا ادارے سے کوئی
تعلق نہیں کسی فرد، مقام یا ادارے سے مطابقت
قطعی اتفاقیہ ہے اس لئے مصنف یا
پبلشر کسی طرح کی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتے۔

قیمت : دو روپے

نقش و نگار

ایکٹریسوں کے افسانے

پردۂ سیمیں کی دو حسیں مدھوبالا اور سیم تن ثریا کی

نذر

جن کے رُمان پرور افسانے وقت پر نہ ملنے کی
وجہ سے شامل اشاعت نہیں کئے جا سکے

.... اور ملاقاتیں

انڈیا فلم جرنلسٹس ایسوسی ایشن کے صدر
جناب فقیر محمد کے نام

جن کے ساتھ میں نے پہلی بار حسین و جمیل ایکٹریسوں
کے حسن و شباب کو نزدیک سے دیکھا اور ان کے
نرم و نازک سیمیں ہاتھوں سے چائے کا لطف اٹھایا

دیباچہ

بلونت سنگھ

اگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

بہ ظاہر فلمی دنیا کے بے تاج بادشاہ لیکن درحقیقت خوشباش بی اے کو ایک مدت سے فلمی دنیا میں البیلے پن سے چوکڑیاں بھرتے دیکھ رہا ہوں، لیکن مجھے اس امر کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ ان کی معصوم چہلیں ایک روز رنگ لائیں گی اور وہ فلمی تیتریوں کے افسانے جمع کرنے میں نہ صرف کامیاب ہو جائیں گے، بلکہ مجھے بھی دیباچہ لکھنے پر مجبور کر دیں گے۔

زلف کو چھیڑا صبا نے ہے ہماری کیا خطا
ہم گرفتار بلا ہیں بے خطا پکڑے گئے

فلمی دنیا کے پرستاروں کو خوشباش صاحب نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد افسانوں کے اس مجموعے کی صورت میں بہت ہی حسین تحفہ پیش کیا ہے - اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس قسم کا مجموعہ تیار کرنا کسی اور کے بس کا روگ بھی نہ تھا یعنی جس کا روگ اُسی کو ساجے -

زیر نظر مجموعے میں کل تیرہ افسانے شامل ہیں اور لکھنے والیوں میں ہندوستان کی مقبول ترین اداکاروں یعنی گیتا بالی، نگار سلطانہ، نروپا رائے، گیتا نظامی، لتا منگیشکر، صوفیہ حسن بانو، نرگس، چاند برق، پرمیلا، منورما وغیرہ کے نام نظر آتے ہیں -

ان افسانوں کا دل چسپ ترین پہلو یہ ہے کہ سب کے سب افسانے ان حسین اداکاروں کی محنت کا نتیجہ ہیں جنہیں ہم بار بار پردہ سیمیں پر دیکھ کر ان کے حسن اور فن کی داد دے چکے ہیں - لیکن معلوم نہیں تھا کہ ایک روز ایسا بھی آئے گا کہ فلمستان کی یہ حسین جادوگرنیاں داد طلب کرنے کا اس قدر ناقابل یقین طریقہ اختیار کریں گی - اب دیکھنا یہ ہے کہ صفِ اول کے بڑے بڑے افسانہ نگاروں پر اس کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے - پیشہ ور افسانہ نگاروں اور حسین تیتریوں کا ایک ہی میدان میں ٹکر لینا نہ صرف بے حد دل چسپ ہے بلکہ خطرناک بھی ہے - عین ممکن ہے کہ مردوں (؟) کو ہتھیار ڈالنے پڑیں -

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے

اس مجموعے کے افسانوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ سب دل چسپ ہیں - یہ ہلکے موڈ کی چیزیں ہیں - بعض چیزیں طبع زاد ہیں، بعض ماخوذ - لیکن دونوں صورتوں

ہیں فن کاروں کے حسنِ بیان اور حسنِ انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے۔

فلمی دنیا کی نوخیز اداکار گیتا بالی کی کہانی ہلکی پھلکی تفریحی چیز ہے۔

پریشان زلفوں والی نگار سلطانہ نے زندگی کے ایک تاریک پہلو کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

معصوم نروپا رائے نے سراپا چلبلی کہانی لکھی ہے

دل نواز گیتا نظامی نے حکیمانہ انداز سے قانون پر طنزیہ افسانہ لکھا ہے۔

نقرئی آواز والی لتا منگیشکر نے مرد کی نفسیات کا ایک بے حد دلچسپ پہلو اجاگر کیا ہے۔

ماہ جبیں چاند برق کی کہانی میں آخری TWIST گویا اس کہانی کی جان ہے۔

آہو چشم پرمیلا نے پڑھنے والوں کو ہنسی ہنسی میں رلا دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

سحر انگیز مسکراہٹ کی ملکہ صوفیہ بہت دور کی کوڑی لائی ہے۔

شیریں لب حسن بانو نے بڑے سنسنی خیز پلاٹ پر کہانی کا محل کھڑا کیا ہے۔

فلمی دنیا کی محبوب ترین ہیروئن نرگس نے "میرے عاشق" کے عنوان سے نہایت دلچسپ چیز لکھی ہے۔ امید ہے کہ قارئین نرگس کے فلمی عاشقوں کو برداشت کر سکیں گے۔

شوخ اور رنگین مزاج منورما نے مختصر ترین الفاظ میں ایک رومان پرور آپ بیتی لکھی ہے۔ کس کی ؟ اوشا کی۔

سدا بہار مرید دلا نے ایک بالکل اچھوتے انداز سے اصلاحی افسانہ لکھا ہے

کتاب کے خاتمے پر ایک گم نام ایکٹریس کی کہانی " ایکٹریس کی ڈائری " گویا . . . .
. . . آخری کیل کی حیثیت رکھتی ہے۔

لیجئے اب آپ کے ہاتھوں میں افسانوں کا ایسا مجموعہ ہے جس کی مثال ہندوستان
کیا دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں مل سکتی۔ اور اس عدیم النظیر کامیابی کا زریں سہرا قلمیات
کے ماہر خصوصی شہزادہ تبسم مسٹر خوشباش کے سر ہے۔

عین ممکن ہے کہ سارا مجموعہ پڑھ لینے کے بعد بعض اصحاب مجھ سے رجوع کریں
اور جاننا چاہیں کہ کیا " سچ مچ یہ افسانے . . . . ؟"

تو جواب عرض کرتا ہوں کہ

" جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے "

بلونت سنگھ

یکم مارچ ۱۹۵۱

گیتا بالی

سے

ملاقات

جب میں پہلی مرتبہ اس معصوم اداکارہ سے ملا تو یہ اُس وقت نہا کر باہر نکلی تھی اور اس کا چہرہ میک اَپ سے کوسوں دُور تھا۔ اس کے باوجود رنگ روپ کا نکھار دیکھ کر مجھے پردۂ سیمیں کی گیتا بالی بھی بھول گئی تھی۔

ہم دونوں ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔ اور جب گیتا کو یہ معلوم ہوا کہ میں بھی پنجابی ہوں تو اس کے چہرے پر ایک انوکھی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ اس نے جی کھول کر میری تواضع کی۔

میرے استفسار پر اس نے اپنے متعلق مجھے یوں بتایا "میں ۱۵ اگست ۱۹۳۰ کو موہیال براہمن خاندان میں امرتسر پیدا ہوئی۔ مشہور فلاسفر اور ریفارمر

پنڈت کرتار سنگھ کے ہاں۔

میری دو بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ میرا بھائی بیک وقت شاعر بھی ہے اور آرٹسٹ بھی، سنگر بھی ہے اور ڈرامہ نویس بھی۔ میری شہرت میں میرے بھائی بہنوں کا بہت ہاتھ ہے۔ میری بڑی بہن رقص میں ماہر تصور کی جاتی ہے۔ اور میں نے دو برس کی عمر ہی میں رقص و سرود کی جانب اپنی توجہ مبذول کر دی۔ اور تین برس کی عمر ہی میں پہلی مرتبہ اپنے بھائی اور بہن کے سٹیج کئے ہوئے ایک ڈرامے میں پبلک کے سامنے پیش ہوئی۔ یہ برسوں کا واقعہ ہے۔

وادیٔ شباب میں قدم رکھنے تک میں ڈانس میں کامل ہو چکی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں میرا پہلا فلمی معاہدہ منظہر خاں کی ایک تصویر کے لئے ہوا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ تصویر سیٹ چڑھ ہی نہ جا سکی۔

اس کے بعد میں نے "سہاگ رات" کے لئے اپنی خدمات ڈائرکٹر کیدار شرما کے پیش کیں، اور سہاگ رات کی شوٹنگ میری زندگی کا کامیاب تجربہ تھی۔ اس فلم کی غیر معمولی کامیابی کے بعد میرے نام کا ڈنکا بجنے لگا اور بیسیوں پروڈیوسر میری کوٹھی کا چکر لگانے لگے۔ مجھے اس کامیابی پر ناز ہے۔

میں اس کے بعد قلیل سے عرصے میں کم و بیش ایک درجن فلموں میں ظاہر ہوئی آج میرے فلمی پروانوں کی تعداد کسی بھی ایکٹریس سے کم نہیں ہے۔

ان دنوں میں نے آٹھ فلموں کے لئے معاہدے کر رکھے ہیں۔ اور شب و روز شوٹنگ میں مصروف ہوں۔ اگر آپ چند منٹ کے بعد آتے تو آج بھی میں آپ کو نہ مل سکتی۔ میرا ارادہ ہے کہ جب یہ فلمیں تیار ہو جائیں تو میں چند دن مکمل آرام کروں

فلموں میں کام کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ بلکہ اداکاری ایک نہایت ہی مشکل فن ہے جس کے لئے محنت اور جاں فشانی کی بہت ضرورت ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ گذشتہ چھ ماہ میں مجھے صرف چند دن کے لئے آرام ملا، وہ بھی بارش کی وجہ سے جب کہ سٹوڈیو میں جانے کے تمام ذرائع بند ہو چکے تھے۔

مجھے کھیلوں کا بہت شوق ہے اور اب میرا ارادہ ہے کہ آئندہ سردیوں میں کشمیر جاؤں اور برف میں پھسلتی رہوں۔

میری زندگی کا سب سے بڑا شوق یہ ہے کہ امریکہ کی مانند رقص و سرود کی ایک اکیڈمی قائم کروں۔ اور ساتھ ہی میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ ہالی وڈ میں جا کر ایک رنگین فلم تیار کروں۔

فی الحال میں نے بھائی بہنوں کے ساتھ ایک فلمساز ادارہ "ہالی سسٹرز" کے نام سے قائم کیا ہے جس کی ایک فلم "راگ رنگ" تیار کی جا رہی ہے۔ اس میں میرے اور بھی رشتہ دار اپنی فن کاری کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ ہدایت کار ڈی۔ ہالی ہیں۔

میری کامیاب فلموں میں بڑی بہن، نیکی اور بدی، گرلز سکول، دلاری، جوہری، غریبی، شادی کی رات، جل ترنگ، بھائی بہن، چمن، باورے نین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔"

جائز جرم

از قلم
فلمسٹار گیتا بالی

جامع مسجد کے سامنے ٹرام رکی اور میں اُترنے لگا۔ سٹینڈ پر منگت رائے بابو کھڑے تھے۔ گھبرائے ہوئے پریشان حال، چہرے پر بدحواسی کے بادل چھائے ہوئے میں نے انہیں زندگی میں پہلی بار اس وقت متفکر دیکھا تھا۔

"ہیلو۔ منگت رائے بابو"

"ہیلو مسٹر منوہر"

"کیا بات ہے بڑے پریشان دکھائی دے رہے ہو"

"آج میرے ساتھ ایک نہایت ہی حیرت انگیز واقعہ پیش آیا ہے آج تو میں گرفتار ہونے لگا تھا۔ یوں سمجھو کہ بال بال بچ گیا۔"

منگت رائے بابو کو میں دس پندرہ برس سے جانتا تھا بڑے با اُصول شخص تھے وہ۔ ان کی ایمانداری قسم کھانے

کے قابل تھی۔ جہاں تک میرا خیال ہے انہوں نے آج تک جھوٹ نہیں بولا تھا جب انہوں نے کہا کہ وہ گرفتار ہونے لگے تھے تو ان کے چہرے کی حالت اور بھی قابل دید ہو چکی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ انہوں نے کوئی جرم سرزد کیا ہے۔ میں نے فوراً پوچھا

"کیا بات ہو گئی ایسی؟ کیا کوئی قانون شکنی کی ہے آپ نے؟"

"جی نہیں" وہ کہنے لگے "میں نے کوئی قابل اعتراض کام نہیں کیا ہے۔ میرا جرم یہ ہے کہ میں بے قصور ہوں۔ میرا گناہ یہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں میں نے قانون کو اس طرح توڑا ہے کہ غیر کی چیز کو اپنا نہیں بنایا۔ سچ بولا ہے۔ صداقت سے کام لیا ہے اور بس۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" میں نے دریافت کیا۔

"آج بدقسمتی سے مجھے ایک فاؤنٹن پن راستے میں پڑا ہوا مل گیا۔ اور میں اسے پولیس سٹیشن میں دینے کے لیے چلا گیا۔ وہ وہاں سے بمشکل جان چھوٹی۔ گرفتار ہونے لگا تھا۔ اگر تمہارے پاس کچھ وقت ہو تو بتاؤں؟"

"ہاں ہاں ضرور بتلائیے۔ مجھے اس سے دلچسپی ہے۔" میری حیرت بڑھ رہی تھی۔ اور میں سب کچھ سننا چاہتا تھا۔

بابو منگت رائے نے کہنا شروع کیا

"بارہ ٹوٹی کے چوک پر اچانک مجھے ایک فاؤنٹن پن مل گیا۔ ادھر ادھر لوگوں سے دریافت کیا۔ لیکن مالک نہ ملا۔ صدر بازار کا تھانہ نزدیک تھا۔ میں نے خیال کیا کہ وہیں جا کر دے آؤں۔ بہت قیمتی پن تھا۔ گولڈ کیپ کے علاوہ اس میں ایک سنہری زنجیر بھی لگی ہوئی تھی۔ جس میں ایک چابی بھی تھی۔ میں تھانے کے دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ دروازے پر ایک سپاہی بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میں نے اپنی گھڑی دیکھی تو ڈیڑھ کا وقت تھا۔

سنتری صاحب کو میں نے جھنجوڑ کر جگایا۔ وہ چھوٹتے ہی کہنے لگے "ہینڈز اپ۔"

مجھے اس کی اس حرکت پر ہنسی آئی اور کہا "سنتری صاحب! ذرا جاگئے۔ میں تھانیدار صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کس لیئے؟" سنتری صاحب نے اپنے مخصوص تعجب سے دریافت کیا۔

"مجھے ایک فاؤنٹن پن ملا ہے۔ نجانے کس کا ہے۔ میں نے خیال کیا چلو تھانے میں جا کر جمع کرا دوں۔ بہت قیمتی چیز ہے۔ اس وقت ڈیوٹی پر کون سے تھانیدار صاحب ہیں؟"

"وہ آرام فرما رہے ہیں"

"آرام فرما رہے ہیں۔ کیا اس وقت ڈیوٹی پر کوئی بھی نہیں جاگ رہا"

وہ ہنس دیا اور کہنے لگا "آپ بھی کمال کے آدمی ہیں۔ ڈیوٹی پر تھانیدار صاحب نہیں جاگا کرتے۔ وہ سپاہیوں میں سے ایک کی ڈیوٹی مقرر کر دیتے ہیں کہ تم جاگتے رہو۔ آج میری باری ہے۔"

"اسی لیئے آپ جاگ رہے ہیں" میں نے ہنس کر کہا "آپ ذرا تکلیف کر کے تھانیدار صاحب کو بلوا دیجئے۔"

اس وقت وہ نہیں آسکتے۔ آپ صبح کے وقت حاضر ہو جایئے گا۔ سنتری صاحب بندوق لے کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے بہت منت سماجت کی لیکن سنتری صاحب کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ مجھے مجبوراً واپس ہونا پڑا۔

اگلے دن فاؤنٹن پن لے کر پھر تھانے گیا۔ اور مجھے تھانیدار صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ میں نے بڑے ادب سے "نمستے" کہا۔ اور وہ اپنی سرکاری شان سے بولے "تم کس کی شکایت کے لیئے آئے ہو؟"

"معاف کیجئے گا، میں کسی کی شکایت کے لئے نہیں آیا میں تو . . . ."

انہوں نے میری بات کو درمیان میں کاٹتے ہوئے کہا "ضرور کوئی دکھڑا ہی لے کر آئے ہوگے۔ تم لوگوں نے ہمارا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اچھا کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

میں نے فونٹین پن سامنے کرتے ہوئے کہا "یہ پن مجھے سڑک پر پڑا ہوا ملا ہے معلوم نہیں کہ کس کا ہے۔ آپ اسے اپنے پاس جمع کرلیں۔ اگر صحیح مالک مل گیا تو اسے دے دیجئے گا۔ بہت ہی قیمتی سا چیز ہے۔"

تھانیدار صاحب نے چمکدار پن کو بڑے غور سے دیکھا اور میری جانب دیکھتے ہوئے کہا "یہ پن آپ کو کہاں سے ملا ہے؟"

"بارہ ٹوٹی کے چوک سے"

"کیسے؟"

"میں جا رہا تھا کہ اچانک میرے پاؤں کے نیچے کوئی چیز۔ دیکھا تو یہ ایک پن تھا۔ جس کے ساتھ سنہری چین اور چین کے ساتھ ایک چابی تھی۔ دو ایک آدمی وہاں سے گذر رہے تھے۔ لیکن کوئی مالک نہ تھا نہ بنا۔ رات کے ڈیڑھ بج چکے تھے۔ یہاں آیا لیکن سنتری صاحب نے آپ کو ملانے سے انکار کر دیا اب حاضر خدمت ہوا ہوں۔"

"اچھا تو تمہارا نام کیا ہے؟"

"منگت رائے"

"باپ کا نام؟"

"لالہ گنیش داس"

"تم رہتے کہاں ہو؟"

"گول مارکیٹ"

"تمہیں کتنے بجے پن ملا تھا؟"

"رات کے ڈیڑھ بجے"

"ایک بات قابل غور ہے۔ تم نے کہا ہے کہ تم گول مارکیٹ میں رہتے ہو۔ اور یہ پن تمہیں بارہ ٹوٹی سے ملا ہے۔ آخر تم رات کے ڈیڑھ بجے وہاں کیا کر رہے تھے۔؟"

"وہاں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ وہ خود کہیں باہر گیا ہوا ہے۔ اس کی بیوی کو لے کر میں سینما دیکھنے گیا تھا۔ اور اسے گھر چھوڑ کر واپس آرہا تھا۔

پولیس کے سپاہی فاؤنٹن پن کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے اور تھانیدار صاحب مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔

"اچھا تو تمہارے دوست کا کیا نام ہے؟"

"افسوس کہ میں یہ بتانے سے قاصر ہوں۔ اس کا پن سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے" مجھے غصہ آرہا تھا۔

"ہمیں تمام بیانات لکھنے ہیں۔ تمہیں ان سوالات کا جواب دینا ہوگا" تھانیدار صاحب مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولے۔

"لیکن افسوس کہ ان باتوں کا تعلق دوسروں کی ذات سے ہے اور ان کا اس واقعہ کے ساتھ بالکل کوئی تعلق یا واسطہ نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں ایک باعزت آدمی ہوں۔ میری آمدنی ایک ہزار روپیہ ماہوار سے زیادہ ہے۔ میں یہاں

بطور ملزم حاضر نہیں ہوا ہوں بلکہ اپنی بلند اخلاقی کا ثبوت دینے آیا ہوں"! میں نے تھانیدار صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

تھانیدار صاحب، اٹھ کر کھڑے ہوگئے، اور بولے "معاملہ پیچیدہ نظر آرہا ہے تم نے اپنا نام بتایا ہے، اس کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ تم نے اپنے باپ کا نام بتایا ہے اس کا تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ تم کہتے ہو کہ تمہاری آمدنی ایک ہزار روپیہ ماہوار ہے کیا تم ہمیں دکھا سکتے ہو۔ اس کے علاوہ تم رہتے ہو گول مارکیٹ اور کہتے ہو کہ پن تمھیں بارہ ٹوٹی کے چوک سے دستیاب ہوا ہے، سوچنے کا مقام تو یہ ہے کہ ایک شریف آدمی رات کو ڈیڑھ بجے گھر سے کیوں نکلا ہے۔ اپنے دوست کی بیوی کے پاس جانے کا آخر مقصد کیا ہے؟ ...."

"دیکھئے تھانیدار صاحب!" میں تنگ کر کہنے لگا "آپ کو اس معاملہ میں جانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پن ملا تھا آپ کو دے دیا ہے۔ اب آپ کا فرض ہے کہ مالک تک پہونچا دیں اور بس"!

"قانونی کارروائیاں اس قدر سیدھی نہیں ہوا کرتیں"! تھانیدار صاحب پن کو دونوں ہاتھوں میں رگڑتے ہوئے بولے "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قیمتی پن تم نے کہیں سے چرایا ہے"۔

"کہیں سے چرایا ہے"۔ میں بے قرار ہوگیا۔

"ضرور چرایا ہے"! تھانیدار صاحب بولے، اور پھر سپاہیوں کو مخاطب کر کے کہا "اس کی تلاشی لو"!

اور میری تلاشی شروع ہوگئی۔ انھوں نے میرے سب کپڑے اتار دیئے یہاں

تک کہ جرابیں تک بھی اتار کر میری تلاشی لی گئی۔ انہوں نے نہ صرف میرے کپڑے اتارے بلکہ پگڑی اچھالی، عزت اتاری۔"

اتنا کہہ کر سنگت رائے بابو کی حالت پھر خراب ہوگئی۔ پریشان ہوگئے اور بولے "میں نے بڑی مشکل سے جان بچائی۔ وہ مجھے گرفتار کرنے لگے تھے۔"

مجھے اپنے دوست کے حادثہ پر ہنسی بھی آرہی تھی، اور افسوس بھی ہو رہا تھا کہ قانون کو لوگ کس قدر بے احتیاطی سے استعمال کرتے ہیں۔ اور کتنے غیر مناسب آدمیوں کے ہاتھوں میں قانون کٹھ پتلی بنا ہوا ہے۔

میں اپنے دوست سے اجازت لے کر فارغ ہوا اور سوچنے لگا کہ موجودہ زمانے میں سچائی کتنا جرم ہے؟

نگار سلطانہ سے ملاقات

جب میں نگار سلطانہ سے ملنے گیا تو وہ سو رہی تھی رات کی شوٹنگ کی وجہ سے گیارہ بجے تک بستر پر ہی کروٹیں بدل رہی تھی۔ اُس کے بھائی صاحب نے مجھے ایک نہایت ہی پر تکلف کمرے میں بٹھا کر چائے پلائی اور اتنے میں وہ شعلہ حسن بھی آ گئی اور میں نے کافی طویل انٹرویو لیا۔

نگار سلطانہ حسن و شباب کا ایک دل فریب مرقع ہے جو آسمان فلم پر آفتاب بن کر چمک رہا ہے یہ ہندوستان کی پہلی ایکٹریس ہے جو مردوں جیسا لباس پہنتی ہے اور مردوں کی مانند باتیں کرتی ہے

حسین چہرہ، مخمور نگاہیں، نازک بدن، باریک کمر، تراشے ہوئے بال، سرخ ہونٹ، مردانہ لباس، نرالی

شان اور انوکھا انداز۔ بس یہ ہے ہزاروں دلوں کی ملکہ نگار سلطانہ کا چہرہ مہرہ جس کی ایک ہی جھلک پردہ سیمیں پر نوجوانوں کو بیقرار کر دیتی ہے۔

یہ اداکارہ ۲۸ جون ۱۹۳۰ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئی۔ شروع ہی سے اسے اپنے ابا جان سے اُلفت تھی اور ان کے ہمراہ ریس کورس میں جایا کرتی تھی۔ اور اس طرح اس کی ملاقات جگدیش سیٹھی سے ہوئی۔ ابا جان کی وفات کے بعد جگدیش سیٹھی ہی کی مدد سے فلمی دنیا میں وارد ہوئی اور سب سے پہلے "رنگ" میں کام کیا۔

اس کے بعد جب وہ جیراج کے مقابل میں "بیلا" میں نمودار ہوئی تو چمک اُٹھی۔ بس اس کی قدر بڑھ گئی۔ ناؤ۔ پتنگا اور بازار نے تو اُسے ایکٹرسوں کی صفِ اول میں لا بٹھایا۔ اب تو نگار کے نام کا سکہ چل رہا ہے۔ کھیل، دل کی بستی۔ دولتی نیا ساودگی۔ خاموش سپاہی۔ ساز، مقدر۔ منزل، شیش محل، باغی اور بکھرے موتی وغیرہ میں کام کر رہی ہے۔

نگار ایک شاہدل حسینہ ہے، اس کے ہاں ہر وقت بیسیوں آدمی موجود رہتے ہیں۔ بے شمار لوگ اس کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں۔ میزبانی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اور یہ بہت زندہ دل واقع ہوئی ہے۔ گھریلو معاملات اور کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ تیرنے میں بھی خوب ہوشیار ہے۔

نگار حیدر آباد سے تعلق رکھتی ہے اور اردو خوب جانتی ہے اور کبھی کبھار افسانے بھی لکھ ڈالتی ہے۔ موجودہ افسانہ تیکنیک کے اعتبار سے ایک قابل قدر چیز ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایکٹرس کے لئے شادی کرنا بہت ضروری ہے اور یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شادی شدہ ہے اور خیر سے "ماں" ہونے کا فخر بھی اُسے حاصل ہے۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی بتایا کہ ہندوستان کی تمام ایکٹرسوں میں خوبصورتی اور اداکاری کے لحاظ سے اُسے "نگار سلطانہ" ہی پسند ہے۔

رات بھر

از قلم
فلمسٹار نگار سلطانہ

رات اندھیری تھی، اور آسمان پر ستارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ دسمبر کا مہینہ، خوب سردی تھی۔ کمبل میں دبک جانے کو جی چاہتا تھا۔ میں بستر کی جانب بڑھا اور لیٹنے کے لئے سوچنے لگا، لیکن اس زمانہ پر در موسم میں اکیلے مجھے نیند کیسے آسکتی تھی۔ میں نے بستر پر جانے کا ارادہ ترک کردیا، اور دل ہی دل میں کہا: "چلو گلی کا ہی ایک چکر لگائیں، اور نہیں تو طبیعت ہی ٹھیک ہوجائے گی۔"

چسٹر اوڑھ کر میں گھر سے نکل پڑا۔ ایک کونے پر ایک عورت کسی شخص سے باتوں میں مصروف تھی۔ اندھیری گلی میں، عورت اور مرد گھل گھل کر باتیں کر رہے تھے مجھے اس دال میں کچھ کالا کالا نظر آنے

لگا۔ میں وہاں کچھ دیر کے لئے رُکا اور پھر چل دیا۔ جس طرح ایک بہتا ہوا تنکا کسی چیز کے ساتھ رک کر پھر بہنے لگتا ہے۔

محلے کی تمام گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ چنانچہ میں نے بازار کا رُخ کیا، وہاں بھی زیادہ رونق نہ تھی۔ جدھر دیکھو لوگ اس طرح چل رہے تھے کہ گویا سردی سے پناہ لینے کی خاطر اپنے گھروں کی جانب جا رہے ہوں۔ ان کے چہروں اور قدموں دونوں سے جلدی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

ایک گھنٹہ اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد میں نے بھی گھر کی راہ لی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر بیوی گھر ہوتی تو کتنا اچھا تھا۔ بہرحال میں ایسی مسرور کن سردی میں اکیلے سونے کے لئے گھر کی جانب چلا جا رہا تھا۔

گلی کے پہلے ہی موڑ پر مجھے ایک عورت جلدی جلدی چلتی ہوئی دکھائی دی۔ اُس کے پیچھے پیچھے ایک نوجوان بھی چلا جا رہا تھا۔ نوجوان بار بار اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا، جس سے خواہ مخواہ شک پیدا ہوتا تھا۔

میں جلدی سے چل کر اس عورت کے نزدیک ہو گیا۔ جب وہ بجلی کے کھمبے کے نزدیک سے گذری تو میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ یہ تو وہی عورت تھی جو تھوڑی دیر پہلے ایک شخص کے ساتھ کھڑی گہری گہری باتیں کر رہی تھی۔ اس نے سفید رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی، جس پر وہ بڑی محرابیں دیکھ کر بے اختیار سجدہ کرنے کو جی چاہتا تھا۔ حسن و شباب کی یہ محرابیں مجھے بے قرار کئے دیتی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

وہ ایک بلڈنگ کے پاس آ کر رکی۔ یہ میونسپل کمیٹی کا "ول فیئر سینٹر" تھا۔ میں تاڑ گیا کہ یہ کوئی نرس ہے۔ نرسوں کے متعلق کئی افسانے اور حادثے میرے دماغ کے ساتھ ٹکرانے لگے

اور میں معاملہ کی تہ تک پہنچنے کے لئے تیار ہو گیا۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، وہ نوجوان بالکل قریب آچکا تھا۔ میں اب اس کے آگے آگے جا رہا تھا۔ اس نے چارپائی پر لیٹی ہوئی ایک لڑکی کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا "اٹھو ولیڈا۔ فیصلہ ہو گیا ہے۔ بڑی مسجد کے پیچھے جاؤ"

وہ اٹھی اور میں آگے ہی چلتا گیا، اور موڑ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ سنسنی خیز انکشافات کی توقع تھی۔ میں چاہتا تھا کہ مال غنیمت میں مجھے بھی کوئی گرم گرم حصہ مل جائے۔ سردی کی رات اور گرم مال کی توقع۔

میں کچھ دیر ٹھیر کر پھر واپس ہو لیا۔ اور ایک بار پھر اس چارپائی اور سینٹر کے پاس سے گذرا۔ وہ نوجوان ایک سفید سی چادر میں کوئی چیز چھپائے جا رہا تھا۔ جب میں نے اُسے دیکھا تو اس نے وہ چادر اور بھی پیچھے کر لی . . . تاکہ میں دیکھ نہ سکوں لیکن جتنا اس نے آگے سے چُھپایا، اتنا ہی مجھے پیچھے سے صاف دکھائی دینے لگا۔

اتنے میں وہ عورت ایک نوجوان لڑکی کو ساتھ لئے میرے سامنے سے گذری۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور میں نے دونوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاکا اور میری نگاہیں بہت دیر تک ان کا تعاقب کرتی رہیں۔

ستارے چمک رہے تھے، اور غالباً وہ بھی اُنہیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور آنکھوں سے ایک دوسرے کو راز کی باتیں سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے گھڑی پر وقت دیکھا۔ گیارہ بج کر سات منٹ ہو چکے تھے۔ میں کچھ سوچ کر پھر اگلے موڑ سے چکر لگا کر ان کے سامنے چلنے لگا۔ وہ ایک بار پھر میرے پاس سے گذریں۔ اس دفعہ ان کی نگاہیں مجھے بہت تیزی اور دلبری سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ کافی دیر تک پیچھے دیکھتی رہیں۔

اب مجھے چین کہاں تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات چکر لگا رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ نرسیں بھی کتنی عجیب اور عجیب سی چیز ہوتی ہیں۔ میں اُنھیں ایک بار پھر ملا۔ ایک اور چکر کاٹ کر ان کے سامنے ہو لیا۔ اور جب وہ میرے سامنے سے گذریں تو میں نے اپنا رُخ پھیر لیا۔ اور ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ ایک نے قہر آلود نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور کہا "آخر آپ ہمارا تعاقب کیوں کر رہے ہیں؟

اُف کتنی دلیری تھی اس کے لہجے میں۔ کتنا رعب تھا اس کی آواز میں۔ کتنی بے باکی تھی اس کے طرزِ تخاطب میں۔

" ابھی آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔" میں نے اُسی لہجے میں کہا۔

"کسی اور کو بیوقوف بنائیے"۔ وہی عورت کہنے لگی جس کو میں نے سب سے پہلے کونے میں ایک شخص سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔" آپ راستہ کاٹ کر چار بار ہمیں مل چکے ہیں۔ کیا آپ نے ہمیں چور سمجھ رکھا ہے۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"بس وہی کچھ چاہتا ہوں جو آپ لوگوں کے پاس ہوتا ہے"! میں جذبات کی رَو میں بہہ کر نہ جانے یہ کیسے کہہ گیا۔

" اچھا یہ بات ہے"۔ وہ مسکرا دی۔

میں نے اُسے ایک طرف بلایا۔ میرے جسم میں ایک نہ معلوم سی طاقت آ گئی تھی۔ کیونکہ میں سمجھ چکا تھا کہ جب بنسی تب پھنسی.... چنانچہ میں نے اس کے ہاتھ میں پانچ روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔" آج ہمارا کام بنا دیجئے"۔

اُس نے مسکراتے ہوئے روپے لے لئے، اور بولی"۔ کیا ابھی آپ کو ضرورت ہے؟"

"جی ہاں! سخت سردی ہونے کے باوجود اب جسم میں تھوڑی سی حرارت

آگئی تھی۔ میں اس کے قریب ہوگیا۔ وہ تھی تو سیاہ فام، لیکن عورت کی تمام دلفریبیاں اور جوانی کی انگڑائیاں اس سے ٹپک رہی تھیں۔

"آپ رہتے کہاں ہیں؟"

"نو پلاٹ کی گلی نمبر دس کے پہلے مکان میں۔"

"وہی جو نیلے رنگ کا ہے؟"

"بالکل وہی۔"

"میں ابھی مس ریڈی کو بھیج دیتی ہوں۔ لیکن اُسے کتنی دیر وہاں ٹھہرنا ہوگا؟" وہ ہاتھ نچاتے ہوئے دریافت کرنے لگی۔

اس مکارہ اور دلالہ کی ان باتوں نے مجھ پر بہت اثر کیا۔ واقعی ان لوگوں کو اس پیشے پر پوری مہارت حاصل ہے۔ دیکھئے ذرہ سی بات میں کتنی بے تکلفی ہوگئی ہے۔

"رات بھر ہی ٹھہرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"رات بھر؟ لیکن پچاس روپے دینے پڑیں گے؟"

"اس چیز کا فکر نہ کریں، اگر ہم خوش ہوگئے تو روپے آخر ہاتھوں کی میل ہوتے ہیں۔"

"جی ہاں!" وہ مسکرا کر کہنے لگی: "آخر لوگ کماتے کس لئے ہیں۔ اگر ایسے موقعوں پر روپیہ خرچ نہ کیا جائے تو اور کن موقعوں پر کیا جائے۔"

"لیکن میں نے آپ کی مس ریڈی کو دیکھا تک بھی نہیں ہے"؟ میں بولا۔

"آپ بالکل بے فکر رہیں۔ وہ موزوں ترین رہے گی۔ اس کی صفائی، طرزِ عمل

اور دوسری باتیں دیکھ کر آپ دنگ رہ جائیں گے۔ پچاس روپے مجھے دے دیجئے۔ میں آدھ گھنٹے میں تمام انتظام کئے دیتی ہوں۔"

مس ریڈی۔ طرزِ عمل، اور دیگر تمام باتیں، ساری رات، پچاس روپے، اکیلا کمرہ، سردی کا موسم، ان تمام چیزوں نے مجھے بے قرار کر دیا۔ اور میں نے فوراً پچاس روپے اس کے ہاتھ میں دے دیئے اور کہا "دیر نہ لگایئے گا، کیونکہ کافی وقت ...."

"آپ اس کا وہم نہ کریں" وہ بات کاٹتے ہوئے کہنے لگی "اسے مسجد کے پیچھے چھوڑ کر آپ کے لئے پورا انتظام فوراً کئے دیتی ہوں۔"

اور میں واپس آگیا۔ گھر آ کر بستر کی چادر وغیرہ درست کی۔ چیزوں کو ترتیب سے لگایا اور خود اس شعلۂ حسن کا انتظار کرنے لگا۔ سانولے رنگ کی عیسائی لڑکیوں سے میں کئی بار آنکھیں لڑا چکا تھا لیکن کامیابی کبھی نہ ہوئی تھی، اور آج رات بھر کے پچاس روپے دے آیا تھا۔

آدھ گھنٹے کے بعد ایک نوجوان سفید چادر میں کوئی چیز لئے میرے کمرے میں داخل ہوا، اور آتے ہی وہ چادر میز پر رکھ دی۔ اس کے فوراً بعد وہ عورت اور مس ریڈی اندر داخل ہوئیں۔ میں نے دیکھا تو چیخ نکل گئی۔ پچاس برس کی موٹی تازی مس، جس کی چلتے وقت وہ پوزیشن ہو جاتی تھی جو بوجھ سے لدے ہوئے اونٹ کی ہوا کرتی ہے۔

"مریضہ کہاں ہے؟" اس عورت نے پوچھا۔

"مریضہ، کون سی مریضہ؟" میں دنگ رہ گیا۔

"کیا ابھی ابھی آپ نے رات بھر کے لئے پچاس روپے نہیں دیئے۔ کیا یہاں کوئی بچّہ پیدا ہونے والا نہیں ہے؟ کیا اس مکان کا نمبر....؟"

مجھے اپنے مشاہدہ کی غلطی کا احساس ہو گیا، اور کہنے لگا "یہاں سے تشریف لے جائیں، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ کوئی اور مکان ہو گا۔"

اور میں جلدی سے دروازہ بند کر کے بستر میں گھس گیا۔ لیکن نیند کہاں؟

نروپا رائے سے ملاقات

نروپا رائے سے میں اس کے اپنے فلیٹ میں ملا۔ مسٹر رائے بھی ساتھ تھے۔ اس ایکٹرس کے متناسب خدوخال نے مجھ پر بہت اثر کیا۔ اور میں لاشعوری طور پر کلیجہ تھام کر رہ گیا۔ مسٹر رائے نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا، اور میں اس حسینہ کے بالکل سامنے بیٹھ گیا۔ اور قدرت کی اس کاریگری کو بہت نزدیک سے دیکھنے لگا۔

مسٹر رائے نے اپنی حسین و جمیل بیوی کے متعلق سب کچھ بتادیا۔ وہ میرے سامنے بیٹھے نروپا کے متعلق ایک ایک بات بتا رہے تھے، اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا میں نروپا رائے کے سیکرٹری سے اس اداکارہ کے متعلق پوچھ رہا ہوں۔

—

مسٹر رائے نے مجھے بتایا کہ نروپا رائے ۴ مارچ ۱۹۳۱ء میں پیدا ہوئی اور اس کی شادی یکم مارچ ۱۹۴۵ء کو ہوئی۔ اس کا قد پانچ فٹ تین انچ اور وزن ۱۲۳ پونڈ ہے۔ نروپا رائے ضلع سورت میں بلسرا کے مقام پر بی۔ بی۔ اینڈ سی آئی ریلوے کے ایک ملازم کے ہاں پیدا ہوئی۔ اور جوان ہوتے ہی قیامتیں ڈھانے لگی۔ ماں باپ کو شادی کی فکر دامنگیر ہوئی۔ لڑکے والے جہیز مانگتے تھے اور داماد کو اتنی بھاری قیمت پر خریدنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔

مسٹر رائے کہنے لگے "فلمی دنیا کی نروپا رائے" اس وقت فقط کوکیلا تھی۔ حسین و جمیل کوکیلا۔ جسے دیکھتے ہی میں اپنا سب کچھ اس کی نذر کر بیٹھا اور وہ بھی پہلی ہی نظر میں میری ہو رہی۔ اس وقت میرا نام تھا کشور چند بلو بھائی۔ شادی کے بعد معاش کی فکر ہونے لگی۔ شادی نے ہماری زندگی کے لئے نئے راستے کھول دیئے۔ میری بیوی کا رجحان فلمی دنیا کی جانب تھا۔ اور میں نے اُسے کہا۔ "پیاری کوکیلا، میں تمہاری خواہش جلد پوری کروں گا۔"

"اس کے بعد میں نے اپنی بیوی کو پردہ سیمیں کی ملکہ بنانے کا ارادہ کر لیا۔" مسٹر رائے کہنے لگے "اور آخر جون ۱۹۴۵ء میں سن مائنڈ پکچرز نے اپنی گجراتی تصویر "رنک، دیوی" میں اسے مخصوص رول دے دیا۔ اس وقت ہماری شادی کو صرف چار ماہ بھی نہ ہوئے تھے۔

گجراتی فلموں میں نام پیدا کرنے کے بعد میں کوکیلا کو ہندوستانی فلموں میں لانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ آخر میں نے اپنا نام "رائے" رکھ لیا۔ اور کوکیلا کو "نروپا رائے" کا حسین نام دے دیا۔ اور اسے ہندوستانی سکھلانے کا مکمل انتظام بھی کر دیا۔

نروپا کو پہلی شاندار فتح فلم "گن سندری" میں ہوئی۔ اور اس کے بعد نصف درجن

فلموں میں نمودار ہو کر اس کی اداکاری کا طوطی بولنے لگا۔ اور یہ فلمی دنیا میں روز روشن کی مانند روشن ہو گئی۔

"چوبے جی" اس کی فلموں میں خاص طور پر قابل ذکر ہے "ہماری منزل" میں بھی اس نے اداکاری کے خوب جوہر دکھائے۔

سوبھنا سمرتھ کے بعد نروپا رائے ہی ایک ایکٹرس ہے جو سیتا جی کا رول خوب ہوشیاری سے ادا کر سکتی ہے "جے ہنومان" میں سیتا بن کر اس نے رام راج والی سوبھنا سمرتھ کو بھی یہ چیلنج دے دیا ہے۔

اس کی تازہ ترین فلموں میں "غریبی" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

نروپا رائے اور مسٹر رائے کو مل کر مجھے اس حسین جوڑے کا مستقبل بہت روشن دکھائی دینے لگا۔ مسٹر رائے اور نروپا رائے واقعی گل و بلبل اور شمع و پروانہ کی مثال پیش کرتے ہیں۔

مسٹر رائے کو اپنی بیوی نروپا رائے پر ناز ہے۔ ان کی بیوی کو اپنی اداکاری پر ناز ہے۔ اور ہمیں صنعت فلم سازی پر ناز ہے کہ اتنے محنتی اور حسین جوڑے نے اپنی خدمات اس کے پیش کر دی ہیں۔ الکھ نرنجن۔ ببل۔ الشور بھگتی۔ کشمیر۔ جے مہاکالی۔ ویر بھیم سین۔ بھنور اور رام جنم میں بھی اس نے اپنی اچھوتی اداکاری اور پختہ فن کے کرشمے دکھائے ہیں۔ اور اب نروپا رائے دھارمک فلموں کی مقبول ترین ہیروئن بن چکی ہے اور درجنوں فلموں میں کام کر رہی ہے۔

لگاؤ ہاتھ

ازقلم
فلمسٹار نروپا رائے

"بوائے"

"جی حضور"

"برف لاؤ"

"ارے لڑکے"

"جی حضور"

"ایک ٹرے چائے لاؤ"

"ابھی لایا حضور"

"لیکن وہ تو سلیم سے محبت کرتی ہے۔"

"ارے بھائی وہ بڑھیا شراب کی پڑیا ہے پڑیا اتنی مکارہ ہے کہ آسمان کو تھگلی لگاتی ہے۔ تمھیں تو بازار میں بیچ ڈالے اور مول تک نہ بتائے۔"

"برف کے لئے جو کہا تھا"

"ابھی لاتا ہوں"

"ہمیں جلدی جلدی چائے پینا چاہیے، ورنہ گاڑی نکل جائے گی۔"

"لیکن میں تو کولڈ کافی پیوں گا۔"

اچھا دو کپ آئس کریم اور لے آؤ۔"

— — — اور

ہوٹل میں خوب رونق تھی۔ ہوٹل اور وہ بھی شملہ کی مال روڈ پر۔ چاروں طرف ایک خاص رونق نظر آتی تھی۔ میرے سامنے تین کرسیاں خالی تھیں۔ وہ بھی کالی میموں نے پُر کردی تھیں۔ وہ تینوں کی تینوں کالی تھیں۔ وہ خود بھی سیاہ تھیں اور ان کے ہاتھ بھی سیاہ تھے۔ ان کی آنکھیں بھی سیاہ تھیں اور ان کے بال بھی۔ لیکن بالوں میں سفید ربن۔ منھ میں سفید دانت۔ اور بدن پر سفید لباس۔ وہ کسی ہسپتال کی نرسیں معلوم ہوتی تھیں۔ نگاہوں میں بے باکی تھی اور جسم میں تناؤ۔ بات میں تیزی تھی اور ہر کام میں پھرتی۔

"بوائے"۔ تینوں نے بیک آواز کہا۔

"جی حضور"! شائد بوائے کا یہی تکیہ کلام تھا۔

میری نگاہیں ان سیاہ و سفید لڑکیوں سے پھسلتی ہوئیں کاؤنٹر کے قریب ایک میز پر بیٹھے ہوئے لمبی لمبی مونچھوں والے شخص پر پیوست ہوگئیں۔ وہ مجھے کافی عرصے سے بغور دیکھ رہا تھا۔

"میرا تھرموس لاؤ"۔

"لایا حضور"!

"میرا تھرموس"۔ میں سوچنے لگا۔ "کیا یہ اس کا ذاتی تھرموس ہے؟
"میرا اخبار لاؤ"!
بوائے نے 'ہندوستان ٹائمز' سامنے رکھ دیا۔
مجھے ایسا محسوس ہونے لگا گویا ہوٹل کا مالک یہی ہے۔ میں نے اُسے پھر دیکھا وہ اب بھی مجھے گھور رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ جاتے ہی اُسے گریبان سے پکڑ لوں اور کہوں "ارے بھلے مانس مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہو۔ آخر میں نے تمہارا کیا زبان کیا ہو کوئی چور سمجھ رکھا ہے کیا"؟
میں نے ابھی اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنایا تھا کہ اس نے میرے نزدیک آ کر کہا۔ "معاف کیجئے گا اگر میں غلطی پر نہیں تو کیا آپ پرتھوی ملک ہیں"؟
"واقعی آپ کا خیال درست ہے" میں نے کہا۔ اور پہلے سے بھی زیادہ غور سے اُسے دیکھنے لگا۔ میں نے اُسے اب تک نہ پہچانا تھا۔
"سنائیے یہاں کیسے آئے۔ کہئے شملہ پسند آیا؟ کتنے دن رہنے کا پروگرام ہے"؟
اس نے میرے پاس بیٹھ کر بیک وقت کئی سوال کر ڈالے۔
"میں کسی آدمی کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ واقعی شملہ پہاڑوں کی ملکہ ہے۔ غالباً دو ایک دن اور ٹھہرنے کا ارادہ ہے"۔ میں نے اس کے سوالوں کا جواب تو دے دیا، لیکن ابھی تک میں معلوم نہ کر سکا کہ وہ کون ہے۔ میں نے دماغ پر کافی دباؤ ڈالا۔
"غالباً تم نے مجھے نہیں پہچانا مسٹر پرتھوی ملک"؟
"جی نہیں"! میں اب بھی سوچ رہا تھا۔
"میرا نام "لال" ہے۔ کیا اپنے لنگوٹیے یار "لالو" کو نہیں پہچانتے"؟

کالج اور سکول کی حسین زندگی کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا۔ حامدہ سے معاشقہ۔ کملا سے چھیڑ چھاڑ۔ بتو سے یارانہ۔ مائی جیواں سے واقفیت اور تانگے والوں کی دوستی۔ یہ تمام باتیں ایک ایک کر کے مجھے یاد آ گئیں۔ اور دُبلا پتلا سکول والا لالو میری آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا نظر آنے لگا۔

"اوہ لالو"! بھئی کتنے بدل گئے ہو۔ میں نے تو پہچانا بھی نہیں۔ کہو کیا کام کار شروع کر رکھا ہے، بڑے ٹھاٹھ دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ ریشمی سوٹ، یہ ولائتی نکٹائیاں، اور یہ ایوننگ اِن پیرس کے سینٹ بھئی معیار بڑا بلند کر دیا ہے۔" اب تو میں نے لالو سے خوب زور کا ہاتھ ملایا۔

"کام کار" لالو نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "یہ تمام سلسلہ جو اس ہوٹل میں دیکھ رہے ہو اسی غلام کے دم سے ہے، تمہارے غلام کے قدموں پر دولت کی دیوی نچھاور ہو رہی ہے۔ جدھر دیکھتا ہوں روپیہ سلامی کرتا ہوا نظر آ رہا ہے۔"

میں نے پرانی بے تکلفی کو کام میں لاتے ہوئے کہا۔ "لیکن دوست آخر اتنا روپیہ لائے کہاں سے ہو۔ کسی کو نقب لگائی ہے، یا کسی بنک کے خزانچی سے یارانہ ہے۔"

"ارے بھائی آج کل تو تمام شملے سے یارانہ ہے۔" وہ ایک لمبا سا کش لگاتے ہوئے کہنے لگا۔ "بڑے بڑے افسر اس غلام کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔"

"ہمیں بھی کوئی ایسا جادو بتا دو۔ تاکہ اور نہیں تو اپنا پیٹ ہی بھر سکیں" میں نے ذرا دیدہ دلیری سے کہا۔

"ارے تم سے کیا چوری ہے۔ سب کچھ بتا دوں گا۔ ذرا یہ تو کہو کہ ویسے ہی ہو یا اب خیالات بدل گئے؟" وہ ذرا نزدیک ہو گیا۔

"ارے بھائی اب تو جذبات پیدا ہوئے ہیں۔ پہلے تو نوجوان تھے، اب جوان ہیں مکمل جوان"۔ میں نے چھاتی ٹھوکتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب" وہ کہنے لگا۔ "کہو شادی ہو گئی ہے یا نہیں؟"

"ارے عقل کے اندھے۔ اگر شادی ہو گئی ہوتی تو شملے کے ہوٹلوں میں اکیلے کیا سر پھوڑنے آتے۔ کل سے ہوٹلوں کے چکر لگا رہے ہیں لیکن ابھی تک مطلب اور کام کا ہوٹل کوئی نہیں ملا"۔ میں نے کہا۔

اس نے رخساروں کو ذرا دائیں جانب دبایا اور کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا "اچھا ہوا کہ تم کنوارے ہو۔ ارے بھائی تمہیں خوب سیر کرائیں گے"۔

"لیکن......"

میں نے ابھی کچھ کہا ہی تھا کہ اس نے گھڑی پر وقت دیکھتے ہوئے کہا "اوہ معاف کیجئے گا۔ مجھے اب کسی کو ملنا ہے۔ آپ رات کو گیارہ بجے کے قریب سپیشل فلیٹ میں تشریف لے آئیے۔ یہ ہے میرا کارڈ، یہ دکھا کر تم آسانی سے مجھے مل سکو گے"۔

"بہت اچھا" میں کہنے لگا۔ "آنے کی ضرور کوشش کروں گا۔" لیکن یہ تو کہو کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟"

"بڑی دیر سے" وہ کہنے لگا۔ "چار بچے بھی ہیں۔ بندر کے بچوں کی مانند۔ خیر جب رات کو آؤ گے تو دکھا دوں گا۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجئے"۔

"رات کو آنا نہ بھولنا" اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کیجئے" میں نے کہا۔

اور وہ شاہانہ شان سے اٹھ کر چل دیا۔

میں نے ہوٹل کا بل ادا کرنے کی خاطر جیب سے بٹوا نکالا۔ اور بوائے کو آرڈر دیا
"بل لاؤ"۔

وہ تھوڑی دیر کے بعد آیا اور کہنے لگا کہ لال بادشاہ نے بل نہ لینے کی تاکید کر دی ہے۔

میں وہاں سے اٹھ آیا، اور رات کا انتظار کرنے لگا۔ ایک ایک پل سال معلوم ہونے لگا۔ میں نے جلدی سے کام ختم کیا۔ مال روڈ کا ایک چکر لگایا، لیکن وہی مال روڈ جس پر چوبیس گھنٹے مٹر گشت کرنے کو جی چاہتا تھا کھانے کو دوڑ رہی تھی۔

ہاں تو نو بج گئے۔ میں وہاں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ دس بجے کے قریب ہوٹل میں پہنچا۔ اور بوائے کو ملاقاتی کارڈ پیش کیا۔ اور وہ مجھے ایک مکلف کمرے میں پہنچا آیا۔ اور کہنے لگا۔" لال بادشاہ پورے گیارہ بجے یہاں آئیں گے۔ آپ انتظار فرمایئے"!

اور میں وہاں ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اتنا مکلف اور پرتکلف کمرہ میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ سامنے کی دیوار پر ایک نہائت ہی رومان پرور سینری بنی ہوئی تھی۔ فن کار نے ایک دریا کا کنارہ پیش کیا تھا جس پر کئی دوشیزائیں نہانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ دو ایک تو پانی میں داخل ہو چکی تھیں۔ ایک کی انگیا اتارتے وقت بازو میں پھنس گئی تھی۔ ایک اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ تین لڑکیاں تو بالکل برہنہ پیش کی گئی تھیں جو نہانے کے لئے بالکل تیار تھیں۔ دریا کے دور تک مرد کا نام و نشان نظر نہ آتا تھا۔ غالباً یہ کنارہ عورتوں کیلئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ حسن و جمال کے یہ ٹکڑے اتنی آزادی سے نہا رہے تھے اور ایک دوسرے سے چہلیں کر رہے تھے۔

میں نے اس سینری کو نزدیک جا کر دیکھنے کی کوشش کی، لیکن بعد میں مجھے اپنی حماقت پر ہنسی آنے لگی۔ اور میں بذاتِ خود کھسیانا سا ہو گیا۔

دیگر دیواروں پر کئی تصاویر آویزاں تھیں۔ قدِ آدم تصویریں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ "جواری کی بیوی"، "پہلا تیر"، "سلامِ محبت"، "چلمن"، اور "شبِ وصل" نام کی تصویریں اتنی دلکش اور دلآویز تھیں کہ باوجود کئی بار دیکھنے کے بھی طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔

ان چیزوں کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد، اور فرش وفروش کو پوری طرح دیکھنے کے بعد میں باہر کی کھڑکی کی جانب متوجہ ہوا۔ یہ کھڑکی ایک چمن کی جانب کھلتی تھی۔ میں کافی دیر تک چمن کا نظارہ کرتا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد مجھے دور سے دو حسین وجمیل لڑکیاں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ گویا چاند کے دو ٹکڑے بادلوں سے نکل کر زمین کی جانب بڑھ رہے ہوں۔ کچھ دیر کے بعد وہ پھولوں ہی میں غائب ہو گئیں۔

"ہیلو پرتھوی ملک! آپ پہلے ہی آ گئے!" اس آواز نے میرے سلسلۂ خیالات اور نظاروں کے تسلسل کو منقطع کر دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو لالو میرے شانے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

"کیسے نہ آتا؟" میں نے کہا اور ساتھ ہی میری نظر اُن تین نہایت ہی فیشن ایبل اور آزاد خیال لڑکیوں پر پڑی، جو لالو کے ہمراہ تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تینوں جوانیاں مسکرا دیں۔ اور ہاتھ کے اشارے سے "آداب عرض" کیا۔

میں نے بھی جواب دیا اور مسٹر لالو کی جانب دیکھا۔ ان کے ساتھ ہی ایک

موٹی سی عورت کھڑی تھی۔ لیکن پوڈر و غازہ نے اُسے بھی لڑکی بنا دیا تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔ اس کی آنکھوں میں ایک طرح کی آوار گی اور بے باکی جھلک رہی تھی۔

لالو نے میری جانب دیکھا اور پھر اس عورت اور لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "دوست! میں نے اپنا کام صرف اس سرمائے سے شروع کیا۔ اب انہی کی بدولت روپیہ میرے قدم چوم رہا ہے۔ یہ میری بیوی اور تین سالیاں ہیں"

سب مسکرا رہے تھے۔ لالو نے پھر کہا: "کہیے مال کیسا ہے؟ لگاؤ ہاتھ"
میں خاموش تھا۔ اور لالو نے مجھے کھینچتے ہوئے کہا: "چلو میرے ساتھ اور دیکھو اس غلام کے ہاتھ۔ وہ مزہ آئے گا کہ عمر بھر نہ بھولو گے"۔
میں اس کے ساتھ ہولیا۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ دیوار پر چلتے ہوئے سائے بتا رہے تھے کہ تین لڑکیوں میں سے ایک ہمارے پیچھے آ رہی ہے اور دو وہیں رہ گئی ہیں۔:

گیتا نظامی

سے

ملاقات

گیتا نظامی ایک ایسی فلمی حسینہ ہے جس کا
شباب عمر کے ساتھ ساتھ پُرشباب بنتا جا رہا ہے۔
اور جس کی جوانی عمر کے ساتھ ساتھ نوجوان ہوتی
جا رہی ہے۔ پنا کی اس پراسرار ہیروئن کو دیکھنے
کے لئے میں عرصہ سے بے چین تھا۔

اور بمبئی آ کر میں نے اسے بھی ڈھونڈ نکالا،
اگرچہ یہ ایک گمنام سی جگہ پر رہتی ہے۔ تاھم
ڈھونڈنے والے سمندر کی تہ سے بھی موتی نکال
لیتے ہیں۔

یہ ماہ پارہ بی۔ آئی۔ ٹی بلاکس میں سکونت
پذیر ہے۔ یہ بلاکس رحمت اللہ روڈ پر واقع ہیں
اور میں نے آٹھ نمبر کا بلاک ڈھونڈ ہی نکالا۔

"میں گیتا نظامی کو ملنا چاہتا ہوں"۔ میں نے ایک سیدھی سادی دیہاتی قسم کی دوشیزہ سے دریافت کیا۔ جو دروازہ کھولنے آئی تھی۔

"آپ اندر تشریف لے آیئے" وہ بولی اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

"کہیئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟" وہ مجھے دری پر بٹھاتے ہوئے بولی۔

"میرا نام خوشباش ہے، اور آپ کو ملنے کے لئے دہلی سے آیا ہوں" میں نے اس کے معصوم چہرے پر شوخ نگاہیں گاڑتے ہوئے کہا۔

"تو گویا آپ ہی فلمی رنگ محل کے مصنف ہیں۔ خوشباش صاحب آپ سے مل کر بہت خوشی حاصل ہوئی ہے۔ آپ نے "فلمی رنگ محل" میں میرے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کے لئے شکریہ۔ پہلے یہ کہیئے کہ آپ کے لئے چائے منگواؤں یا کچھ اور؟"

"تکلف کو رہنے دیجئے" میں نے کہا۔ "مجھے تو آپ سے مل کر حیرت ہو رہی ہے میں تو کچھ اور ہی خیال کئے بیٹھا تھا۔ اور یہی سمجھتا تھا کہ آپ بھی نرگس، نگار، اور بیگم پارہ کی مانند "صاحب بہادر" ہوں گی۔ یہاں تو معاملہ ہی بالکل برعکس ہے۔ آپ تو ایک پنجابی دوشیزہ معلوم ہو رہی ہیں۔"

گیتا نظامی نے نوکر کو چائے لانے کا حکم دیا۔ اور بولی "خوشباش صاحب مجھے فخر ہے کہ میں ایک نہائت ہی سادہ اور پرانی طرز کی ایکٹرس ہوں۔ نہ تو مجھ میں فلمی پریوں کے سے ناز نخرے ہیں اور نہ ہی فلمی طوائفوں کی سی شان و شوکت ہے۔ میں تو فقط آرٹ کی خدمت گار ہوں۔ پنجابی اس لئے دکھائی دے رہی ہوں کہ پنجابی ہوں۔ میرا خانگی نام رشیدہ بیگم ہے اور میں ۲۶ر فروری ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئی تھی۔ اور میری جائے پیدائش "پپیاں" ہے۔ گویا میں فرنٹیئر کی

رہنے والی ہوں۔ بچپن ہی میں مجھے سینما کا شوق تھا۔ ایکٹرسوں کے رنگ روپ میں بہت دلچسپی سے دیکھا کرتی تھی اور پھر ممتاز شانتی کو دیکھ کر سمندِ شوق کو ایک اور تازیانہ لگا۔ اور میں اپنے چچا برکت نظامی کے ہمراہ بمبئی آگئی۔ اور بسنت فلم کے لئے کانٹریکٹ کیا۔ میری اولین فلم پنجابی کی "پٹولا" تھی۔

مجھے اپنی فلم "پتا" پر ناز ہے، جسے نجم نقوی نے ڈائرکٹ کیا تھا۔ اس فلم پر گورنمنٹ کی جانب سے مجھے ۲½ ۹ ہزار روپے انعام ملا تھا۔ اور اس شاہکار نے جب اندور میں سلور جوبلی منائی تو مجھے ایک چاندی کا کپ انعام دیا گیا اور ریاست کی جانب سے مجھے پچاس پونڈ بطور خراجِ تحسین عطا فرمائے گئے۔

اس کے علاوہ میں نے ڈائرکٹر ایڈوانی کی سسّی پنوں، دیدی کی کمرہ نمبر ۹، شوری دولنا نوی کی یار، ڈائرکٹر بوس کی موتی، حبیب سرحدی کی رہنما، کے۔ بی ماتھر کی گجرے، وغیرہ فلموں میں کام کیا۔

"کروٹ" میری زندگی کی عجیب تصویر ہے۔ اسے پہلے تو ڈائرکٹر دیدی نے ڈائرکٹ کیا۔ لیکن پھر جھگڑا ہو گیا۔ اور پروڈیوسر نے تھیٹر لگا کر پکچر چھین لی۔ اور پھر رنجیت کے پرکاش نے اسے ڈائرکٹ کیا۔ زاں بعد میرا کانٹریکٹ "رنگین زمانہ" اور "شبنم" کے ساتھ ہوا۔ شبنم میں میں نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ اور رنگین زمانہ فائینس نہ ملنے کی وجہ سے دھرے کا دھرا رہ گیا۔

اب میری فلم "انتظار" بن رہی ہے۔ جس کا مہورت بھی ہو چکا ہے اس میں پروڈیوسر ڈائرکٹر ریش کے علاوہ یعقوب اور مسز شیش کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ گھنگرو میں بھی نمودار ہو رہی ہوں۔

مجھے گیتا نظامی نے اپنے متعلق بہت کچھ بتایا اور کہا" میری زندگی مصیبتوں سے پُر رہی ہے۔ میں نے جہاں اپنے رشتہ داروں سے دُکھ اٹھائے ہیں وہاں فلمی لوگوں کے بھی بہت مصائب برداشت کئے ہیں۔ اس کے باوجود لوگ میری زندگی کو" پُر کیف اور درمان پرور" تصور کرتے ہیں۔ میں گانا جانتی ہوں۔ ڈانس کی تو ماہر ہوں۔ پتّا میں میرے نلچ عروج پر ہیں۔ اگست ۱۹۴۹ء میں میں نے ایک مشہور تاجر مسٹر نور محمد سے شادی کرلی تھی۔ اور اب اپنا نام رشید انور رکھ لیا ہے۔"

اس سلسلے میں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ گیتا نظامی کئی سالوں سے 'ماں' بن چکی ہے۔

خوش نصیب

از قلم
فلمسٹار گیتا نظامی

کمرۂ عدالت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی انسانی سروں کا ایک سمندر موجیں مارتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ننگے سر، ٹوپی والے سر، ہیٹ والے سر، سفید بالوں والے سر، غرضیکہ ہر قسم کے سر دکھائی دے رہے تھے۔ لوگوں کا اتنا بھاری ہجوم اس سے پہلے عدالت میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ سب فیصلہ سننے کے لئے بیقرار تھے۔

بھیڑ کو چیرتا ہوا ایک شخص آگے بڑھا۔ تمام سر ہلنے لگے۔ فضا میں ایک کھلبلی سی مچی اور پھر سکوت ہو گیا۔ وہ شخص تیر کی مانند جج کی کرسی تک جا پہنچا۔ سب کی نگاہیں اس نووارد پر جم گئیں۔

یہ عجیب قسم کا انسان تھا۔ ڈھیلے ڈھالے اور

پھٹے پرانے کپڑے، بال منتشر، چہرے پر افلاس کے بادل چھائے ہوئے، آنکھوں سے وحشت برستی ہوئی، وہ جاتے ہی کہنے لگا: "اصل قاتل میں ہوں، سیٹھ کو میں نے قتل کیا ہے۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو؟" جج نے کہا۔

"سیٹھ کو میں نے خود قتل کیا ہے۔ یہ شخص جو بطور ملزم پیش ہوا ہے بالکل بے گناہ ہے۔ عدالت کا فرض ہے کہ ایک بے گناہ آدمی کو بچائے۔ اُسے قتل کرنا سچائی کو قتل کرنا ہوگا۔" وہ شخص ذرا اور آگے سرکا۔

"خاموش!" جج نے گرج کر کہا۔ "جرم ثابت ہو چکا ہے، قاتل نے اقبالِ جرم کر لیا ہے، عدالت کی تمام کارروائیاں مکمل ہو چکی ہیں۔ گواہ بھگت چکے ہیں۔ ہم بھلا تمہارے کہنے پر کیسے اعتبار کر لیں۔ یہ عدالت ہے بازار نہیں۔ عدالت کسی بھی شخص کو بغیر تحقیقات کے سزا نہیں دے سکتی۔"

"لیکن......"

"خاموش۔ فیصلہ ہو چکا ہے، آپ یہاں سے چلے جائیں۔"

اور وہ وہاں سے چل دیا۔ سر جھکائے، بازو لٹکائے اور منہ بنائے۔

چھ دن کے بعد؟

عدالت کی فضا میں پھر ارتعاش پیدا ہوا۔ ایک شخص پھر آگے بڑھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے جج تک جا پہنچا۔ سب حیران ہو گئے۔

جج نے اس کی جانب دیکھا۔ یہ وہی شخص تھا۔

"سوداگر کے مکان کو میں نے آگ لگائی ہے۔ میں اس شخص سے بدلا لینا چاہتا

تھا۔ اس نے مجھ پہ بہت ظلم کیئے، آخر تنگ آ کر میں نے اس کے مکان کو دیا سلائی دکھا دی۔ میں خوش تھا کہ یہ مر جائے گا، لیکن بچ نکلا ہے"۔

جج نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "خاموش! تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو سوداگر کے مکان کو اس نے خود آگ لگائی ہے۔ اس کا مکان بیمہ شدہ تھا۔ وہ بیمہ کمپنی سے روپے وصول کرنا چاہتا تھا۔ اس نے خود تسلیم کر لیا ہے"۔

"اس نے نہ جانے کیوں ایسا کہا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مجرم میں ہوں"۔ وہ اپنی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"آپ کے کہنے سے عدالت اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتی"۔ جج نے کہا۔

"لیکن........"

"خاموش! عدالت لیکن ویکن کچھ نہیں سن سکتی۔ ہمارا فیصلہ ہو چکا ہے۔ عدالت اپنے فیصلہ کو بدل نہیں سکتی۔ آپ یہاں سے چلے جائیں"۔ یہ جج کی آواز تھی۔

اور وہ وہاں سے چل دیا۔ سر جھکائے، بازو لٹکائے اور منھ بنائے۔

اور پھر ایک ہفتہ کے بعد!

وہ عدالت میں داخل ہوتے اور جاتے ہی جج صاحب کی جانب دیکھ کر کہنے لگا "یہ شخص بے گناہ ہے، اس لڑکی کو میں نے اغوا کیا ہے، اور........"

"خاموش"! جج نے کہا "تم جھوٹ بولتے ہو۔ دراصل تمہیں اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ تم نے کوئی گناہ کیا ہے۔ عدالت ایسی بے سر و پا باتوں پر ایمان نہیں لا سکتی تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ پاگل خانے بھجوا دیئے جاؤ گے"۔

وہ پھر چل پڑا۔ کیا حقیقت کا اظہار ہی دیوانگی ہے۔ کیا اقبال جرم بھی دیوانگی

ہے۔ کیا۔۔۔۔۔۔"

"خاموش! عدالت تمہاری باتوں سے اکتا چکی ہے۔ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ ورنہ عدالت کو کوئی اور کارروائی کرنا پڑے گی۔ عدالت ایسے لوگوں کی سزا جانتی ہے تم نکل جاؤ۔"

وہ ایک دفعہ پھر عدالت سے نکل گیا۔ سر جھکائے، بازو لٹکائے اور منھ بنائے۔

اور اگلے دن صبح۔۔۔۔ وہ بازار گیا۔ وہاں سے اُس نے ایک چھرا خریدا، دھار تیز کرائی اور ایک گلی میں جا کر ایک بے گناہ معصوم بچے کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ اتفاق سے اُسے کسی نے نہ دیکھا، وہ خونی چھرا لئے عدالت میں حاضر ہوا۔ اور جاتے ہی کہنے لگا "میں نے ایک بچے کا قتل کیا ہے، ایک معصوم بچے کا میں قاتل ہوں۔ مجھے گرفتار کیجئے۔ مجھ پر مقدمہ چلائیے۔ مجھے پھانسی کی سزا دیجئے۔" جج نے چوتھی بار جب اس کو عدالت میں دیکھا اور دیکھتے ہی کہنے لگا "تم خاموش رہو۔ عدالت کو معلوم ہے کہ تم یہ کہنے آئے ہو کہ تم نے کوئی جرم کیا ہے۔ تم واقعی پاگل ہو۔ اور ایسے لوگوں کی جگہ پاگل خانہ ہے۔" جج نے سپاہیوں کو بلا کر کہا "اس شخص کو پاگل خانے میں لے جاؤ۔ اس کا دماغ چل گیا ہے۔"

دو ہٹے کٹے سپاہیوں نے اُسے پکڑ لیا اور اُسے باہر کی جانب لے چلے۔ وہ ہنس دیا اور بولا "خدا کا شکر ہے کہ آخر میری محنت رائیگاں نہ گئی۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ میرا معاش اور رہائش کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔" اُس نے اطمینان کا سانس لیا اور سپاہیوں کے ساتھ عدالت سے نکل گیا جہاں سے وہ کئی بار نا امید ہو کر نکلا تھا۔ لیکن آج وہ خوشی سے جا رہا تھا، شانے اکڑائے، سر اٹھائے۔

لتا منگیشکر سے ملاقات

لتا منگیشکر ان دنوں ہندوستان کی مقبول ترین
پلے بیک سنگر خیال کی جاتی ہے، اس کی آواز میں
اتنا ترنم ہے کہ آبشاروں کی آواز بھی کانوں کو
چبھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لتا نازک اندام بھی ہے
اور نازک مزاج بھی۔ اس کی ہر ادا سے نزاکت ٹپکتی ہے
اس خوش گلو ساحرہ سے ملنے کے لئے میں بھی
بیتاب تھا، اور جب نوشاد صاحب نے اس کی
تعریف کرتے ہوئے کہا "میں تو لتا ہی کو ہندوستان
کی بہترین پلے بیک سنگر کہوں گا۔ یہ اپنے فن میں
پوری مہارت رکھتی ہے اور ہر گانے اور ہر ٹون کو
چشم زدن میں سیکھ لیتی ہے۔ میں پیار سے اسے
"مشین" کہا کرتا ہوں"۔ تو اتنا سن کر میں بیقرار ہو گیا۔

اور نوشاد صاحب سے اس کا خانگی پتہ معلوم کر کے نانا چوک میں اُسے جا ہی ملا۔

یہ بہت خندہ پیشانی سے پیش آئی، یہ ایک نہایت ہی نازک اندام لڑکی ہے اس کی معصومیت قسم کھانے کے قابل ہے۔ اس نے مجھے اپنے پاس بٹھایا۔ چائے پلائی اور کیک۔ ٹوسٹ بٹر۔ نہ جانے کیا کیا کچھ کھلایا۔ بہرحال اُس نے مجھے اپنے متعلق سب کچھ بتا ڈالا۔

لتا کا پورا نام لتا دینا ناتھ منگیشکر ہے۔ یہ ۲۶ ستمبر ۱۹۲۹ء کو اندور میں پیدا ہوئی، اور وادئ شباب میں قدم رکھنے سے قبل ہی اس نے مرہٹی فلموں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ اس کی پہلی فلم "منگلا گوہر" تھی، اور یہ متواتر سات برس تک مسٹر ونایک کی فلموں میں کام کرتی رہی۔ ۱۹۴۷ء میں فلم "مجبور" سے پلے بیک دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ اور ایک ہی فلم میں اس کا طوطی بولنے لگا۔ اس کی آواز پر ردیوں کی جھنکار ہونے لگی۔ پچاس سے زائد فلموں میں گانے دے چکی ہے۔ مجبور، انداز، ضدی بڑی بہن، سمادھی، ساون بھادوں، انوکھا پیار، دلاری، بابل، برسات اور لچھی وغیرہ کے اکثر گانے اس کے ہیں، لچھی کے تمام گانے اس نے گائے ہیں۔ ضدی میں کامنی کوشل کے سب گانے اس نے گائے ہیں۔ بڑی بہن کے دو مشہور ترین گانے "چلے نہیں جانا" اور "چپ چپ کھڑے ہو۔ ضرور کوئی بات ہے" اسی کا کرشمہ ہیں۔

سھلکا اور جیون یاترا میں کام کر چکی ہے۔ مندر اس کی مقبول ترین فلم ہے۔ نورجہاں اور نوشاد کو بہت پسند کرتی ہے۔

یہ ماہ پارہ ابھی تک دوشیزہ ہے، پیانو بجا سکتی ہے۔ مہمان نوازی میں خوب ماہر ہے۔ مرہٹہ خاندان کی ہونے کے باوجود اردو شاعری سے اُنس ہے

شاستر بھی گانا گانے کا فن اپنے والد صاحب دینا ناتھ کے بعد امان علی خاں بنڈی بازار والے سے سیکھا ہے، کسی کالج میں نہیں سیکھا۔

اگر حسین گلے کے ساتھ ساتھ خود بھی حسین ہوتی تو نرگس، کامنی کوشل اور گیتا بالی کی جگہ کو یہی لے لیتی۔

آپ سن کر حیران ہوں گے کہ فلم انداز میں نرگس کے۔ آئینے میں سلوچنا چیٹرجی کے رات کی رانی میں منور سلطانہ کے۔ بڑی بہن میں گیتا بالی کے۔ محل میں مدھو بالا کے، برسات میں نمی کے۔ بازار میں نگار کے، شاستر میں کامنی کوشل کے۔ گونا میں اوشا کرن کے۔ اور انمول رتن میں مینا کے گانے لتا منگیشکر ہی نے گائے ہیں۔ گویا مذکورہ بالا حسین و جمیل ایکٹرسوں کی حسین آواز اور نقرئی صداکا راز اسی مغنیہ کی خوش الحانی میں پوشیدہ ہے دنیا میں بھی اسی کی آواز وجد طاری کر دیتی ہے ؞

تعارف

از قلم
فلم سٹار لتا منگیشکر

بات سے بات نکلتی ہے۔

سگرٹ اور منہ سے دھوآں نکل رہا تھا

چائے سے بھاپ نکل رہی تھی اور ہمارے میز

پر بات سے بات نکل رہی تھی۔ نہ جانے بات کہاں

سے شروع ہوئی اور کہاں تک پہنچ گئی۔ مسٹر گنیش

کہنے لگا "ابھی پرسوں کی بات ہے کہ ہمارے نریندر جی

کی بیوی ان کے ایک دوست کے ساتھ بھاگ گئی

ہے"

اسلم نے کہا "میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ عورت

ذات ہوتی ہی بدذات ہے"

کلدیپ نے ایک زور کا کش لگاتے ہوئے کہا

"میں تو دنیا والوں کا رویہ دیکھ کر اس مرحلے پر پہنچا

ہوں کہ بیوی کو زیادہ آزادی دینا ہی غلطی ہے۔ میرا تو یہاں تک خیال ہے کہ مرد کو اس معاملے میں زیادہ محتاط ہونا چاہیئے، اور اپنے دستوں کو بھی بیوی سے نہ ملانا چاہیئے"

کلدیپ کی بات پر ایک پرزور قہقہہ پڑا اور میں نے کہا۔ "بھائی کلدیپ" یہ فلسفہ بھی تم نے خوب نکالا۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ میں تو عورتوں کی آزادی کے پورے حق میں ہوں۔ عورت ایک نہائت ہی بلند اخلاق شخصیت کا نام ہے۔ وہ ہر ایک کی عزت کرتی ہے۔ آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں تو آزاد خیال ہونے کے باوجود بلند اخلاق اور اعلیٰ چال چلن کی مالک ہوتی ہیں۔ عورتوں پر شک کرنے والے خود کمینے اور بداخلاق ہوتے ہیں"۔

ہنلال نے میری ہاں میں ہاں ملا کر کہا۔ "واقعی عورت خود بخود اس قدر نہیں گر سکتی۔ اگر میری بیوی میرے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتی ہے یا کھانا کھاتی ہے تو میں اس میں ذرا بھی عار نہیں سمجھتا اور نہ ہی اس کو نامناسب کہہ سکتا ہوں۔ ہمارے دوست ہمارے بھائی کے برابر ہوتے ہیں۔ اگر ہماری بیوی بھائی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتی ہے تو دوست کے ہمراہ کیوں نہیں کھا سکتی۔ عورت کا دل آئینے کی مانند صاف اور آبِ حیات کی مانند مقدّس ہوتا ہے۔ خانگی عورت اپنے شوہر کے سوا کسی غیر مرد کو دیکھنا بھی گناہِ عظیم تصور کرتی ہے"۔

کلدیپ نے ٹیڑھی نگاہوں سے ہماری جانب دیکھا اور کہا۔ "بھائی صاحب آپ اونچے گھرانے کی عورتوں کی بات کر رہے ہیں۔ جن میں شرم و حیا نام کو نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں تو عورتیں شوہر کے بھائی اور اپنے سسر سے بھی پردہ کرتی ہیں جو ان کے باپ کا درجہ رکھتے ہیں۔ پردہ اور گھونگھٹ ہی عورت کی شان ہوتے ہیں۔ ان سے نکل کر ان کی آنکھ پھٹ جاتی ہے۔ اور ایسی عورت جسے آنکھ کی شرم نہ ہو وہ کسی کرتوت سے بھی دریغ نہیں

کرتی"۔

مجھ سے نہ رہا گیا، اور کلدیپ سے کہا"۔ دوست کلدیپ آپ کو کسی نے بہت بڑی غلط فہمی میں ڈال دیا ہے۔ دوستوں کا بیوی سے ملنا کسی حالت میں بھی قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اگر ہمارا دوست ہماری بیوی کو بھی نہیں پہچان سکتا تو آخر یہ دوستی کس کام کی ہے۔ میں گذشتہ دنوں کافی الجھنوں میں پھنسا رہا ہوں، ورنہ میں تو اپنے تمام دوستوں سے اپنی بیوی کو انٹروڈیوس کرا چکا ہوتا۔ اور اب بھی ارادہ ہے کہ بیوی کو سب دوستوں سے ملاؤں گا ایک شاندار دعوت میں"۔

"صرف آپ کی رائے اور خیال کچھ وقعت نہیں رکھتا"۔ یہ کلدیپ کی آواز تھی۔

"اور اسی طرح آپ کا فتوے بھی کچھ قیمت نہیں رکھتا"۔ میں نے ڈانٹ کر کہا۔

بات سے بات کیا نکلی، بات بڑھ گئی۔ کلدیپ بھی اپنی ضد پر قائم تھا اور میں بھی۔ میں نے عہد کر لیا تھا کہ بحث کے ذریعے سے یا عملی طور پر کسی نہ کسی طرح کلدیپ کو ضرور اس بات کا قائل کرا دوں گا کہ بیوی کا اپنے دوست کو ملنا اور اس سے بات چیت کرنا ہرگز معیوب نہیں ہے۔

جب ہوٹل سے باہر نکلے تو میں نے مسٹر کلدیپ اور مسٹر اسلم کو اتوار چائے پر اپنے ہاں بلایا۔ اور کافی تاکید کی، اور یہ بھی کہہ دیا کہ اگر وہ نہ آئے تو میں بہت ناراض ہوں گا۔

اگلے ہی دن مسٹر اسلم کا خط مجھے مل گیا کہ وہ اتوار کو حاضر نہیں ہو سکے گا۔ وہ ایک ضروری کام کے لیے کہیں باہر جا رہا ہے۔ اسلم نے اپنے خط میں تمام مجبوریاں سمجھا دی تھیں۔

میں کلدیپ کا منتظر تھا۔ کم از کم میں اسے ضرور نیچا دکھانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ منگل، بدھ، ویرسپت، ہر ایک ایک دن پہاڑ معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے کملا کو

کہہ دیا تھا کہ اتوار کو میرا دوست آنے والا ہے، اس کے لئے چائے کا خوب اچھی طرح سے انتظام کرنا۔

سینچر وار کو میں دو بجے ہی دفتر سے واپس آ گیا۔ کملا کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے اپنا بڑا جہیز والا ٹرنک کھولا ہوا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پٹڑی والا شرنارتھی، اچانک پولیس کا سپاہی آ جانے سے سب کچھ اُٹھا کر یہاں لے آیا ہے اور بھاگم بھاگ کی وجہ سے تمام چیزیں بکھر گئی ہیں۔

"کیا بن رہا ہے پیاری"؟ میں نے جاتے ہی سوال کیا۔

"ٹرنک میں کافی بے ترتیبی تھی۔ میں نے سوچا کہ ایک دفعہ تمام چیزیں نکال کر پھر جوڑ لوں تو خوب رہے گا"۔ وہ میری جانب محبت سے دیکھتے ہوئے بولی۔

اگرچہ میری شادی کو ایک سال سے بھی زیادہ عرصہ ہو گیا تھا، لیکن اُسے میں اپنے پاس اب ہی لایا تھا۔ مشکل سے دس پندرہ دن ہوئے تھے، یہی وجہ تھی کہ ابھی تک ہم دونوں میں تکلف ہی چلتا تھا۔

"کیا میں بھی امداد کروں"؟

"اجی نیکی اور پوچھ پوچھ"۔ وہ پھر مسکرائی۔ اُس کی آنکھوں سے غضب کی مستی اور مدہوشی ٹپک رہی تھی۔ آج کملا مجھے پہلے سے بھی پیاری اور معصوم دکھائی دے رہی تھی

میں نے اس کی مدد شروع کر دی۔ جہیز کا ٹرنک بھی اچھا خاصا جنرل سٹور بنا ہُوا تھا۔ اس میں کپڑے بھی تھے اور پاؤڈر کریم بھی، بادام، میوہ اور ناریل بھی، نالی اور زیورات بھی۔ رومال بھی تھا اور صابن بھی۔ کاپی بھی تھی اور کاغذ بھی، غرضیکہ اس ٹرنک میں ہر چیز موجود تھی۔

میں ایک ایک چیز صاف کر کے کملا کو دیئے جا رہا تھا۔ پاؤڈر کریم کا بڑا جار صاف کر کے میں نے اُسے دیا۔ اس کے بعد ایک بُرادار تولیہ اُسے دیا جس میں ریشمی آزاربند اور کئی رومال تھے۔ رانی ہار والا ڈبہ اور لیڈی رسٹ واچ کی خالی ڈبیہ بھی اُسے دی۔ صابن کی ایک ڈبیہ صاف کر کے بھی اُس کے ہاتھ میں دے دی جس میں سوئیاں کلپ اور نیل پالش تھی۔ ایک شیشی ڈیل اور تین لپ سٹک بھی میں نے رومال سے صاف کر کے کملا کے نازک نازک ہاتھوں میں دیں۔ اس کے بعد میں ایک ایک سوٹ اور ساڑھی ترتیب سے اٹھا کر اُسے دینے لگا۔

جونہی میں نے بنارسی ساڑھی نکالی۔ نونسن پن کا ایک کیس نیچے سرک آیا۔

"خوب! تو تم سے چوری پن بھی رکھے ہوئے ہیں"۔ میں نے کہا۔

"یہ پن نہیں ہے"۔ اُس نے ڈبہ میرے ہاتھ سے چھینتے ہوئے کہا۔

"جو کچھ بھی ہے مجھے دکھا دو"۔

"آپ کے کام کی کوئی چیز نہیں"۔

"میں ضرور دیکھوں گا"۔ میرا اشتیاق بڑھ گیا۔

وہ ڈبیہ کو پھر ٹرنک میں رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ اور اُسے کھولا۔ سُرخ رنگ کے کاغذ میں کوئی چیز بڑی احتیاط سے لپیٹی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے کاغذ پھاڑ کر وہ چیز نکالی۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی کہ اس کاغذ میں ایک معمولی سی پنسل کا ننھا سا ٹکڑا لپٹا ہوا ہے۔ اس طرح تو کوئی پیار کر بھی نہیں رکھتا۔

"یہ پنسل کیسی ہے"؟ میں نے دریافت کیا

"یہ ایک یادگار چیز ہے۔"

"کیا مطلب! اس سمولی سی پنسل سے تمہاری کیا یادگار وابستہ ہو سکتی ہے؟"

میرے لیے یہ چیز عجوبہ بن گئی۔

"آپ کو پھر کبھی سناؤں گی" کملا نے کہا۔

"لیکن میں تو ابھی سننا چاہتا ہوں"۔ میں بھی ٹرنک بند کر اس کے اوپر بیٹھ گیا۔ تاکہ اس کی توجہ صرف میری جانب ہو جائے۔

"اچھا تو بات یہ ہے"۔ وہ پنسل کا قصہ سنانے لگی "یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب کہ میں بی۔ اے میں داخل ہوئی تھی۔ ابھی ہماری پڑھائی مکمل طور پر شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ ہمارا انگلش کا پروفیسر بیمار پڑ گیا۔ اس کی جگہ ایک نیا پروفیسر آیا۔ لمبا جوڑا اور خوبصورت نوجوان ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ابھی ابھی امتحان پاس کر کے یہاں آگیا ہے۔

لیکن پہلے ہی دن اس نے تمام لڑکیوں پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا۔ اس نے ایسا لیکچر دیا کہ ہم دنگ رہ گئیں۔ جب وہ پڑھا کر کمرے سے نکل گیا تو سب لڑکیاں اس کی تعریف کر رہی تھیں۔

اگلے دن سب نے بڑی بے صبری سے اس کا انتظار کیا' وہ وقت مقررہ پر پہنچ گیا۔ اور پہلے کی مانند دلچسپی سے پڑھانے لگا۔

حسن اتفاق سے میں اپنا پن گھر ہی بھول آئی تھی۔ نوٹس لکھنے کے لیے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ پروفیسر صاحب نے مجھے اس حالت میں دیکھا تو لکھنا ترک کر دیا اور دریافت کیا۔ "آپ اپنے نوٹس کیوں نہیں لکھ رہیں؟"

"میں اپنا پن گھر بھول آئی ہوں"۔

"کہیں اپنے آپ کو بھی گھر ہی میں نہ بھول آنا۔" اتنا کہہ اُس نے اپنی جیب سے چھوٹی سی پنسل نکال کر دے دی۔ اور میں اُس سے نوٹ لکھنے لگی۔

اور اس دن کے بعد پروفیسر صاحب نہ آئے۔ ان کی پنسل اب تک میرے پاس ہے۔ جب بھی میں اُسے دیکھتی ہوں تو اپنے پروفیسر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، جس نے صرف دو گھنٹے ہمیں پڑھایا تھا۔"

اتنا کہہ کر اُس نے پنسل کو پھر اُس کاغذ میں لپیٹ اُسی پن والے کیس میں ڈال دیا۔ اور وہیں رکھنے لگی۔

مجھے ہنسی سی آئی اور دریافت کیا "کیا اس دن کے بعد تم نے پروفیسر کو دیکھا ہی نہیں"؟

"اگر دیکھ لیتی تو آج یہ پنسل بطور یادگار میرے پاس نہ ہوتی"۔

"کیا آپ اُس پروفیسر کا نام جانتی ہیں؟ کیا تم اُسے پہچان لوگی؟" میں نے دریافت کیا۔

"پہچاننے کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اس کا نام، اس کا نام غالباً بی۔ ایس کلدیپ ہے۔"

بی۔ ایس کلدیپ کا نام سن کر مجھے ایک دھچکا سا لگا اور وہاں سے چلا آیا۔ اور اپنے کمرے میں پہنچ کر کلدیپ کو اس مضمون کا تار دیا۔

"افسوس کہ آج رات کو بمبئی جا رہا ہوں۔ اتوار کو چائے والا پروگرام آپ فی الحال تا اطلاع ثانی ملتوی تصور فرمائیں"۔

اتوار کی صبح کو میں نے کملا کو بتایا "میرے دوست کا تار آگیا ہے۔ وہ آج

چائے پر نہیں آئے گا۔

اس واقعہ کو کئی برس ہو چکے ہیں۔ کملا پہلے والی حسین کملا نہیں رہی بلکہ پانچ بچوں کی ماں بن چکی ہے۔

کلدیپ والا مسئلہ اب تک دوبارہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ کبھی کبھی میرے بوڑھے دماغ کے ساتھ یہ بات ٹکراتی ہے کہ اگر میں دوستوں اور بیوی کے میل ملاقات کو معیوب نہیں سمجھتا تو آج تک میں نے کلدیپ اور کملا کا تعارف کیوں نہیں کروایا؟

چاند برق سے ملاقات

"ایور گرین ہوٹل کھار میں داخل ہو کر ہی میں نے ایک شخص سے دریافت کیا کہ فلمسٹار چاند برق کہاں رہتی ہے؟

اس نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا" ساتھ والے کمرے میں"

یہ شخص فلمسٹار ہیرالال تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے ایک ماہ پارہ سے دریافت کیا" کیا فلمسٹار چاند برق اسی جگہ رہتی ہے؟"

"چک اٹھا کر اندر آجائیے"۔ اندر سے آواز آئی۔

اور میں چک اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔

ہوٹل کا ایک معمولی سا کمرہ تھا۔ جس میں پلنگ

پلنگڑی، موڑھا، میز، کرسی، ڈرائنگ ٹیبل اور پنگوڑا سب چیزیں موجود تھیں۔

"تشریف رکھیئے"۔ وہ ماہ پارہ مجھے پلنگ دکھاتے ہوئے بولی اور میں وہاں بیٹھ گیا، جس طرح گاؤں کا چودھری کسی اونچی مسند پر بیٹھ جاتا ہے۔

غالباً آپ نے چاند برق کو نہیں پہچانا۔" وہ حسینہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولی۔" اسی ناچیز کو لوگ چاند سمجھتے ہیں اور یہی برق ہے۔ وہی چاند جو پردہ سیمیں پر اپنی چمک سے لوگوں کی آنکھیں چندھیا دیتا ہے، اور وہی برق جسے دیکھ کر جلوۂ طور کا دھوکا ہوتا ہے"۔

تو گویا آپ ہی ہیں چاند برق، جس کی میں "فلمی رنگ محل" میں اس قدر تعریف کر چکا ہوں" میں نے "فلمی رنگ محل" بیگ سے نکالتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں! وہ مسکرا کر بولی۔" جس کے متعلق آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ اُسے کاجل اور سرمے سے بہت الفت ہے"۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ میں نے کاجل آج تک استعمال نہیں کیا اور نہ ہی سرمے کی شوقین ہوں۔ مجھے تو اس بات پر فخر ہے کہ میں اپنی پرائیویٹ زندگی میں بالکل سادہ اور گنوار قسم کی ایکٹرس ہوں۔ سیر کو جاتے وقت بھی میک آپ نہیں کرتی"۔

"خیر" میں نے کہا۔" بڑھا بھی لیتے ہیں کچھ زیب داستاں کیلئے" کے مصداق ایسا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اب اپنے مختصر حالات زندگی بتائیے"۔

اس نے انگڑائی لی اور کھڑی ہو گئی اور پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر میرے سامنے والے پلنگ پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی :۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ میں چک جھمرہ میں ۲ر فروری ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئی۔

آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ میرے ایک ورجن بھائی بہن ہیں اور ہمارے خاندان کے تمام افراد گورنمنٹ سروس میں ہیں، کوئی آئی سی۔ ایس ہے اور کوئی پی۔ سی۔ ایس"

اس پر میں ہنس دیا اور کہا "آئی۔ سی۔ ایس کا ہی مطلب ہے نا "آئس کریم سیلر اور پی۔ سی۔ ایس کا مطلب ہے پوٹیٹو چاپ سیلر"

اس پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ اور اپنی تعلیم کے متعلق یوں کہنے لگی "میری تعلیم بی۔ اے تک ہے۔ میں دہلی کے اندر پرست کالج میں پڑھتی رہی ہوں گانا خوب اچھا جانتی ہوں۔ کالج کے ڈراموں میں خوب حصّہ لیا کرتی تھی۔ ڈائرکٹر زنجن کی معرفت فلمی دُنیا میں آگئی ہوں۔ میں نے سب سے پیشتر "کہاں گئے" میں کام کیا، اور اس کے بعد فرض، موہنی، چنریا، تارا، روشنی، پردہ، ہماری منزل اور آنچل میں کام کیا۔ اب بمبئی ٹاکیز کی فلموں میں کام کروں گی۔

پہلی فلم کے بعد ہی میں نے ڈائرکٹر زنجن سے شادی کر لی تھی۔ اسے آپ لَو میرج کہیں یا کچھ، بہرحال ہم نے شادی سے پہلے ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھا ہُوا تھا۔ میری بہترین تصویر آنچل ہے، اگرچہ اس میں مجھے بطور سائڈ ہیروئن ہی نمودار ہونا پڑا تھا۔

میں کرہین ہوں، میرا اصلی نام ایڈلین وینس برگ ہے، میری زندگی بہت ہی خوشگوار ہے۔ میرا لڑکا بُلبل مجھے بہت پیارا لگتا ہے، لیکن میں اسے ایکٹر ہرگز نہ بننے دوں گی، اگر وہ ایسا کرے تو میں اُسے گولی سے بھی اڑانے سے دریغ نہ کروں گی۔

لاہور میں میں نے خوب عیش کی تھی۔ میری کار بھی تھی، نوکر بھی تھے اور شاندار مکان تھا۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ اور دوسرے اب میرے خیالات بھی بدل چکے ہیں۔ میں زیادہ دلچسپی بھی نہیں لیتی۔

میں ایک عجیب ایکٹرس ہوں۔ میرے لئے دلیپ کمار عورتوں سے بھی گیا گذرا ہے۔ ہندوستانی سکرین میں مجھے تو کوئی اچھا ہیرو نظر ہی نہیں آتا۔ ایکٹرسوں میں مجھے منورما پسند ہے، دیکھو کتنی گول مول اور اچھی خاصی ہے۔ اس میں تمام خوبیاں ہیں۔

میں گھر کا تمام کام خود کرتی ہوں، کھانے پکانے میں مہارت ہے۔

اس کے بعد نوکر نے کہا۔ "کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

چاندبرق نے مجھے کھانے پر بہت مجبور کیا۔ لیکن میں کھانا کھا کر آیا تھا۔ اور وہ بے صبری سے ڈائرکٹر نرنجن کا انتظار کرنے لگی۔ اور پھر فلم "شان" کا بک لٹ نکال کر پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ "شان" "چاندبرق" کی تازہ ترین فلم ہے۔ جس کی شوٹنگ میں وہ مصروف تھی۔

محراب کے نیچے

از قلم:۔ فلم سٹار چاند برق

پانچ بجتے ہی میں ہوٹل سے باہر نکل پڑا۔ میرا دماغ طرح طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنا ہُوا تھا۔ میں سوچتا جا رہا تھا کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ اور پھر رنجیت کے یہ الفاظ کہ "بھئی یہ بمبئی ہے یہاں اس سے بھی کہیں زیادہ ہوتا ہے"۔ بس یہی کچھ دیکھنا چاہتا تھا۔

محرابیں شروع ہو گئیں اور پہلی ہی محراب کے نیچے ایک حسین و جمیل دوشیزہ کھڑی تھی۔ نہ وہ اینگلو انڈین گرل معلوم ہوتی تھی اور نہ ہی پنجابی لڑکی۔ اس نے عجیب فیشن بنا رکھا تھا۔ اس کے بال عیسائی لڑکیوں کی مانند کٹے ہوئے تھے۔ اور وہ خشک ہونے کے باوجود ملائم اور چمکدار تھے۔ اُنھیں دیکھتے ہی میں

بیقرار ہو گیا۔ اور ایک بار تو میرا جی چاہا کہ ان پر ہاتھ پھیرنے لگوں۔ یا اُنھیں اچھی طرح پکڑ کر سونگھنے اور چُومنے لگوں۔ وہ بال کئی لہروں میں تقسیم ہوئے تھے، اور چار یا پانچ لہریں یوں دکھائی دیتی تھیں گویا آبِ حیات کی ندیاں بہہ رہی ہوں۔

اس کے کانوں میں سنہری بالیاں تھیں، بالکل باریک اور بیحد چمکدار۔ چہرہ گورا چٹا اور دانت سفید موتیوں کی مانند۔

اس نے کالے رنگ کی تنگ سی فراک پہن رکھی تھی جو کہ گھٹنوں تک پہنچتی تھی۔ یہ فراک اوپر سے اتنی تنگ تھی کہ دیکھنے والوں کو سینے سے پھٹی ہوئی نظر آتی تھی۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گویا دو حسین گیندیں کپڑے کا غلاف پھاڑ کر ابھی باہر آتی ہیں فراک کے نیچے تنگ پائنچوں والی شلوار تھی۔ اور گردن کے گرد سُرخ رنگ کا مہین سا دوپٹہ لٹک رہا تھا۔ جو اگلی جانب سے دونوں گیندوں کو اپنے حلقے میں لیے ہوئے تھا۔ اور پچھلی جانب سے زمین کو چومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اس حسینہ کے پاؤں میں زریں چپل تھی۔ اور آنکھوں میں کاجل کی ڈوریاں کانوں تک پہنچ رہی تھیں اور پھر میک اپ۔۔۔ وہ سر سے لے کر پاؤں تک دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی مجھے مسٹر رجینٹ کا یہ فقرہ یاد آگیا "جونہی اندھیرا ہوا، بمبئی کی آزاد خیال لڑکیاں محرابوں کے نیچے اکٹھی ہو گئیں، اور جس سے بات بنی اسی کے ساتھ ہو لیں"۔

میں سوچنے لگا۔ کیا یہ میرے ساتھ بھی آسکتی ہے؟

اُسے دیکھتے ہی بمبئی کی تمام باتیں بائیسکوپ کی تصویروں کی مانند میری آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگیں۔ میں اس کے ذرا قریب ہو گیا۔ جیب سے رومال نکال کر

اُسے بلا کر اس شعلۂ حسن کو اس نرالے طریقے سے اپنے پاس بلایا۔ اور خوش قسمتی دیکھئے کہ وہ ایک ہی اشارے سے میرے قریب آگئی۔

"ال۔فینس۔ٹن۔چل۔لو"۔ (الفنسٹن چلو) میں نے ان دو لفظوں کو توڑ کر گانا شروع کر دیا۔

اس نے ایک بار میری جانب دیکھا اور پھر یکایک مُنھ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ میرا حوصلہ اب بڑھ چکا تھا۔ "میرے ساتھ چلو گی؟" میں نے مُنھ دوسری جانب کر کے اُسے سُنا کر کہا۔

وہ اپنی جگہ سے ذرا ہلی۔ جونہی وہ کچھ کہنے لگی تھی کہ اتنے میں ایک چھوٹا سا لڑکا اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کی عمر کوئی دس گیارہ برس کی تھی۔ اس نے خاکی رنگ کی نیکر اور سفید قمیض پہن رکھی۔ دونوں کپڑوں میں شاید صرف ایک ہی بٹن لگا ہوا تھا۔

اُسے دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے لڑکے کے کان میں کچھ کہا اور پھر وہ چلا گیا۔ یہ پارۂ حسن اب پھر اکیلے رہ گئی اور محراب کے نیچے ٹہلنے لگی۔

میں اپنی جگہ سے ہٹ کر دو محرابیں چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اور مُنھ سے سیٹی بجانے لگا۔ وہ پھر میرے قریب آگئی۔ اب تو میرا حوصلہ گزوں لمبا اور منوں بھاری ہو گیا۔ میں نے اُسے دیکھ کر مسکرانا شروع کر دیا۔ وہ تو پہلے ہی سے مُسکرا رہی تھی۔ میں اس کے کافی قریب ہو گیا۔ اور اب کے میں نے قدرے زور سے کہا۔ "الفنسٹن ہوٹل چلو"۔

اُس نے سُن لیا تھا۔ اور اس پر اُس نے زور سے اپنے بالوں کو جھٹکا دیا۔ میں تو نہ سمجھا کہ کہا مطلب ہے اس سے۔ بہرحال محراب کے نیچے ہی کھڑا رہا۔

اتنے میں وہ لڑکا پھر آ گیا۔ دوشیزہ نے ایک بار پھر میری جانب دیکھا میں مطلب سمجھ گیا۔ اور رومال ہلاتا ہوا "الفنسٹن چلو" کہتا ہوا آگے آگے ہو لیا۔ اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی کچھ انتہا نہ رہی کہ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

دروازے پر وہ رکی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا، اور میں نے دبی آواز سے کہا "میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔" میں آگے آگے چلتا گیا۔ مڑ کر دیکھا تو وہ بھی برابر اٹھلاتی ہوئی اور جوانیاں بکھیرتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔

میری عجیب حالت تھی، دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ وہ بھی اندر داخل ہو گئی۔ اور مجھے دیکھتے ہی بولی۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"یہ تو مجھے پوچھنا چاہئے تھا۔ کہ آپ یہاں کیوں آئی ہیں" میں نے ہنس کر کہا۔

نہ جانے اس کی ہنسی کیوں غائب ہو چکی تھی۔ وہ میری جانب دیکھ کر کہنے لگی "آپ کا یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟"

"اور آپ کا یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ تو میرا اپنا کمرہ ہے"

"اور یہ میرا بھی اپنا کمرہ ہے۔" میں نے کہا۔

میں اس کے مذاق پر ہنس رہا تھا کہ کتنی دیدہ دلیر ہوتی ہیں یہ لڑکیاں۔ میں نے ہنس کر اس کی جانب دیکھا۔ اور وہ مجھے دیکھ کر کہنے لگی "مجھے تو آپ کی عقل پر تعجب ہو رہا ہے۔ آخر آپ بتاتے کیوں نہیں کہ میرے کمرے میں آنے کا آپ کو کیا حق ہے؟"

"لیکن یہ تو میرا کمرہ ہے۔" اب مجھے کچھ شک سا پڑ گیا۔

"آپ کس نمبر میں رہ رہے ہیں۔"

"نمبر چودہ میں۔" میں نے کہا۔

"معاف کیجئے گا یہ نمبر ۲ ہے۔ چودہ نمبر کا کمرہ اسی جگہ اوپر والی منزل میں ہے" اور مجھے ایک دھکا سا لگا۔ کمرے کے چاروں جانب دیکھا تو کہیں پتی کوٹ لٹک رہے تھے، اور کہیں سینڈل رکھے تھے۔ ایک کرسی پر تین رنگ دار باریک سی انگیا لٹک رہی تھیں۔

"معاف کیجئے گا غلطی ہوئی۔" کہتے ہوئے میں وہاں سے نکل آیا۔ اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ دسمبر کا مہینہ تھا، لیکن مجھے پسینہ آ رہا تھا، نہ جانے کیوں؟

پرمیلا سے ملاقات

انڈیا فلم جرنلسٹس ایسوسی ایشن نے اسے
مس انڈیا کا اعزاز دیا تھا۔ اور میں جانتا تھا کہ
یہ تقریباً نصف درجن بچوں کی ماں ہے۔ ڈائرکٹر
کمار کی بیوی، اور اس عمر میں "مس انڈیا" کا خطاب
میں حیران تھا۔ اور اس دوشیزہ کو دیکھنے کے لئے
بے قرار۔

بمبئی پہنچ کر سمند شوق کو پھر مہمیز لگی۔ اور
میں اُسے ملنے کے لئے فریرا مینشن جا ہی پہنچا۔
سب سے پہلے میں نے یہی سوال کیا "آپ کو مس انڈیا"
کا خطاب کیوں ملا ہے۔"

میں نے سوال تو کر دیا۔ لیکن جواب اپنے
سامنے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ پرمیلا واقعی ایک

"دوشیزہ" دکھائی دیتی تھی۔ گورا رنگ، سڈول بدن، اُبھرے ہوئے رخسار اور کھلا ہوا سینہ کا گلزار۔ وہ ہنس کر بولی "آپ جانتے ہیں کہ میری عمر تیس برس سے بھی زیادہ ہے۔ پانچ بچوں کی ماں ہوں۔ اور اس کے باوجود کنواری دکھائی دیتی ہوں۔ غیر کی لمس سے بالکل غیر مانوس۔ غالباً آپ کو یاد نہیں کہ ۱۹۴۶ء میں "ساؤتھ انڈیا جرنلسٹس ایسوسی ایشن کی جانب سے بھی مجھے ایسا ہی اعزاز ملا تھا۔ بیوٹی پرائز۔ اور مجھے فخر ہے کہ اس وقت نسیم، مہتاب اور وینا کے مقابلے میں مجھے انعام عطا کیا گیا تھا۔ کیا یہ میری عظیم الشان فتح نہیں ؟"

"مسٹر خوشباش!" پرمیلا میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولی "آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ہندوستان کا مشہور فوٹو گرافر مسٹر انبالال پٹیل میرے تین فوٹو لے کر ہالی وڈ گیا اور ان تینوں تصویروں کو بین الاقوامی مقابلے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اور فوٹو گرافر کو ہالی وڈ سے میڈلوں سے بھرا ہوا بکس اور دس تولے سونے کا تمغہ بطور انعام ملا۔ اس قابل قدر فن کار نے میری ان تین تصویروں کو "ماڈسٹی"، "وِکی" اور "پرمیلا" کے ناموں سے پیش کیا تھا۔"

اس کے بعد میں نے اس حسین و جمیل اداکارہ سے اس کے متعلق کئی باتیں دریافت کیں۔ اور اس نے اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ کہ وہ کلکتہ کے ایک یہودی خاندان میں ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئی اور عین عالم جوانی میں فلمی دنیا کی جانب راغب ہو گئی۔ ۱۹۳۶ء میں جب کہ وہ سترہ برس کی تھی تو پہلی مرتبہ پردہ سیمیں پر جلوہ گر ہوئی۔ اس کی پہلی فلم "مہامایا" تھی۔ لیکن کامیابی نے اسے "مدر انڈیا" میں جلوہ دکھایا۔ اس کی مارکیٹ بن گئی۔ اور یہ بسنت، دوسری شادی، نصیب اور بڑے نواب صاحب میں خوب کامیابی سے آئی۔ ان کے علاوہ اس نے کئی فلموں میں کام کیا ہے لیکن اُن میں اسے بنی مرضی کے خلاف رول ملا ہے۔ "ویمپ" کا

رول خوبی سے ادا کر سکتی ہے۔

اسے ڈرامیٹک، کومک، اور ٹریجک رول پسند ہیں۔ وہ مدت سے کیسٹوم فلموں میں کام کرنا چاہتی ہے، لیکن اب تک اسے موقعہ نہیں ملا۔ یہ سٹنٹ فلموں کی بہترین ہیروئن تصور کی گئی ہے۔ بجلی، جنگل کنگ، شہزادی اور راشن پرنس وغیرہ فلموں میں کام خوب کیا ہے۔

سلور فلمز اس کا اور اس کے شوہر مسٹر کمار کا ذاتی ادارہ ہے۔ جس کی تصویریں "بڑے نواب صاحب" "اور دیور" خوب کامیابی حاصل کر چکی ہیں۔ پرمیلا نے بتایا کہ 'دیور' فلم کے لئے انہیں تین لاکھ روپے کا نقصان ہوا۔ فساد کی وجہ سے انہوں نے یہ فلم برائے نام قیمت پر فروخت کر دی، اور ڈسٹری بیوٹروں نے خوب ہاتھ رنگے۔ اس تصویر کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی اس کی نمائش نے فلمی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔

پرمیلا کا شادی کا نام شبنم بیگم علی ہے۔ اس کی تعلیم ایف۔ اے تک ہے جس کالج میں تعلیم حاصل کی تھی اُسی میں مسٹریس مقرر ہو گئی تھی۔

پرمیلا جہاں سکرین کے لئے ایک موزوں ایکٹریس ہے وہاں وہ کمار صاحب کے لئے ایک مکمل اور باوفا بیوی بھی ہے۔ اُسے سینے پرونے اور کھانے پکانے میں خوب مہارت حاصل ہے۔ ناچنا خوب جانتی ہے۔ اور یہ کہتی ہے کہ اگر اس کے پاس بے پناہ دولت ہوتی تو ستارہ کے ہمراہ تمام دنیا کا چکر لگاتی اور ہندوستانی رقص کے وہ نمونے مغربی دنیا کے سامنے پیش کرتی کہ لوگ دنگ رہ جاتے۔

پرمیلا انگریزی میں خوب ماہر ہے۔ اس کے ننھے منے بچے بھی خوب روانی سے انگریزی بولتے ہیں۔ پرمیلا نے سب سے زیادہ معاوضہ فلم 'شالیمار' میں شالی کا کردار کرنے پر لیا تھا۔ اس فلم میں اسے ساڑھے ستاون ہزار روپیہ دیا گیا تھا۔ اسے کمپنی کے خرچ پر لاہور

نے گئے تھے اور یہ اپنی " بے بی " کے ہمراہ وہاں گئی تھی۔ اس " بے بی " کے ہمراہ جو اس
وقت پیدا نہیں ہوئی تھی اور جس کا نام ہے " جون " اور جسے " نقی جہاں " بھی کہتے ہیں۔
پرمیلا سنہ ۱۹۳۶ء سے ڈائرکٹر کمار کی محبوبہ اور سنہ ۱۹۴۰ء سے اس کی بیوی ہے
انہوں نے سنہ ۱۹۴۰ء میں لو میرج کی تھی اور غالباً یہ اسی وقت یہودی سے مسلمان بنی تھی۔

گاہک

ازقلم
فلمسٹار پرمیلا

وہ اکثر اپنی گھڑی درست کروانے کی غرض سے میرے پاس آیا کرتی تھی، اور متواتر کئی بار کی آمدورفت سے وہ میری واقف بن گئی، بطور ایک گاہک اُسے مجھ پر اعتماد تھا، اور غالباً یہی وجہ تھی کہ بعض اوقات وہ گھڑی دے کر پورا ایک ایک مہینہ شکل بھی نہ دکھاتی تھی۔ اور جب آتی جلدی میں ہوتی اور کہتی کہ "اگر کل تک میری گھڑی درست نہ ہو گئی تو ایسے ہی لے جاؤں گی!" یہ دھمکی دے کر وہ چلی جاتی اور دس بارہ دن کے بعد آتی۔

وہ بیوہ تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا شوہر جنگ میں مارا گیا تھا۔ وہ اپنے گھر میں اکیلی رہا کرتی تھیں۔ اس کے ہاں ایک لڑکی بھی تھی جو شادی

سے پہلے پیدا ہوتی تھی۔

ایک بار جب وہ میرے پاس آئی تو ایک نوجوان دوشیزہ اس کے ہمراہ تھی۔ وہ دوشیزہ جس پر حُسن اور شباب پورے اُبھار پر تھے، اور جو کیف درومان کی ساری رنگینیاں اور دلفریبیاں اپنے دامن میں لئے ہوئے تھی۔ میں نے اس کی جانب دیکھا تو اس نے آنکھیں نیچی کرلیں۔ اس کی پلکیں بارِ حیا سے جھک گئیں۔ رخساروں کا رنگ سُرخ ہوگیا اور جسم میں ارتعاش سا پیدا ہوگیا۔

"آج آپ کے پاس ایک نئی گھڑی لے کر آئی ہوں" اس عورت نے لڑکی کی گھڑی میرے کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ تو پرانی گھڑیوں کا گودام ہے۔ بیمار گھڑیوں کا ہسپتال ہے۔ یہاں بھلا نئی گھڑیوں کا کیا کام ہے۔" میں نے ازراہ تمسخر کہا۔

وہ ہنس دی اور بولی "نئی گھڑی کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی دوکان پر یہ پہلی مرتبہ لائی گئی ہے۔ دیکھئے یہ میری لڑکی کی گھڑی ہے۔ اسے جلد درست کرنے کی کوشش کیجئے۔"

میں نے گھڑی لے کر کھولی۔ واقعی اس کی مشینری بالکل نئی تھی۔ میں نے معائنہ کیا تو اسے معمولی سی صفائی کی ضرورت تھی۔ میں نے کہا "اچھا آپ کو آج سے تیسرے دن مل جائے گی۔"

"لیکن ہمیں تو کل چاہئے۔" یہ اس لڑکی کی آواز تھی جواب تک نگاہیں نیچی کئے کھڑی تھی۔

"کوشش کروں گا۔" میں نے اس حسینہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ اور پھر اس عورت کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا "یہ صاحبہ کون ہیں؟"

وہ ہنسی اور بولی "یہ میری لڑکی ہے"۔

"آپ کی لڑکی۔؟" میں نے تعجب سے پوچھا "آپ نے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ آپ اپنی شادی کے نو دس برس بعد بیوہ ہو گئی تھیں اس جنگ عظیم میں اگر آپ کی شادی کو صرف دس برس ہی ہوئے ہیں تو یہ ہے۔ پندرہ سولہا برس کی آپ کی لڑکی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"یہ شادی سے پہلے پیدا ہوئی تھی۔" اس نے نہایت دیدہ دلیری سے کہا۔ اور اُس دن مجھے معلوم ہوا کہ یہ بچپن سے ہی بہت رومان پرور واقع ہوئی ہے۔ کیپٹن صاحب سے اس کی شادی "سول میرج" کے طور پر ہوئی تھی۔ اور وہ جنگ میں کام آ گئے تھے۔ اور اب یہ اپنی لڑکی کے ساتھ رہ رہی ہے۔

اور اس طرح وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو گئی۔ اس کی عمر بتیس پینتیس برس کی تھی، لیکن صحت کا یہ عالم تھا کہ اس کا ایک ایک انگ پکار پکار کر کہہ رہا تھا "ابھی تو میں جوان ہوں"۔

ایک دن وہ میرے پاس آئی۔ کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔ کہنے لگی "کیا آپ میری کچھ مدد کر سکیں گے"۔

"کیسی مدد؟" میں نے دریافت کیا۔

"مجھے پانچ سو روپے درکار ہیں"۔

"پانچ سو روپے؟"

"جی ہاں صرف چند دن کے لئے۔ آپ کو جلد واپس کر دوں گی"۔

اگر میرے پاس . . . ."

"خیر کچھ بھی ہو۔ میری خاطر کچھ انتظام کیجئے۔ آپ کا احسان عمر بھر نہ بھولوں گی۔"

وہ میرے نزدیک آگئی اور کہنے لگی "کیپٹن مرحوم نے اپنے کسی رشتہ دار سے پانچ سو روپے قرض لیا تھا۔ اب تک اس رشتہ دار نے روپے کا تقاضا نہیں کیا۔ اب اس کی حالت سخت قابل رحم ہے۔ میری شرافت کا تقاضا ہے کہ اس کی مدد کروں۔ اگرچہ دنیا کی نگاہوں میں یہ مدد ہوگی لیکن درحقیقت میں اپنا بوجھ ہلکا کروں گی۔"

ذرا دیر کے بعد پھر وہ کہنے لگی "ضرور کوئی بندوبست کیجئے۔ اگر آپ ضروری سمجھیں تو لڑکی کی گھڑی گروی رکھ جاتی ہوں۔"

میں نے روپے کا انتظام کر دیا۔ گھر جا کر اپنی بیوی سے پانچ سو روپے لا کر اس کے حوالے کئے۔ اور وہ مسکراتی ہوئی چل دی۔

دو ماہ گذر گئے۔ اس نے شکل نہ دکھائی۔

اور اس کے بعد ———— ؟

ایک دن اچانک وہ میری دوکان میں داخل ہوئی اور آتے ہی معذرت کرنے لگی۔ اور بولی "معاف کیجئے گا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ باوجود کوشش کے آپ کے روپے کا انتظام نہیں کر سکی۔ میری لڑکی اب بالکل جوان ہوگئی ہے۔ اس نے معیار زندگی بلند کر دیا ہے۔ گھر کے اخراجات غیر معمولی طور پر بڑھ گئے ہیں۔"

میں خاموشی سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔

وہ تھوڑی دیر کے لئے چپ ہوئی اور پھر ایک لیڈی رسٹ واچ جیب سے نکالتے ہوئے بولی "یہ گھڑی اپنے پاس رکھ لیجئے یا خرید لیجئے تاکہ آپ کا قرضہ ادا ہو جائے۔"

مجھے اس پر اعتماد تھا۔ دو ماہ کے بعد آ کر معذرت کرنا، گھڑی بیچنا اور ایک غریب

رشتہ دار کی امداد کرنا، مرحوم شوہر کا قرضہ ادا کرنا، یہ ایسی باتیں تھیں جس نے اسے اخلاقی طور پر میری نظروں میں بہت بلند کر دیا تھا۔ میں نے اس طرح گھڑی خریدنا یا گروی رکھنا نامناسب خیال کیا اور اسے کہا "آپ یہ گھڑی اپنے پاس رکھیے۔ اگر کوئی سیکنڈ ہینڈ گھڑی خریدنے والا گاہک آ گیا تو آپ کے ہاں لے آؤں گا۔"

اس نے ایک بار پھر شکریہ ادا کیا۔ اور وہاں سے چل دی۔ جاتی بار پھر کہہ گئی "اس بات کا ضرور خیال رکھئے گا۔"

چند دن کے بعد ایک شخص میرے پاس آیا۔ لیڈی رسٹ واچ مانگی۔ میں نے اسے کئی نمونے دکھائے، لیکن اسے کوئی پسند نہ آیا۔ وہ کہنے لگا "مجھے کوئی پرانا سکہ چاہیے۔ آج سے چند سال پہلے جو ماڈل آئے تھے اُن میں سے دکھایئے۔"

"اگر آپ کو ایک پرانا ماڈل سیکنڈ ہینڈ اچھی حالت میں مل جائے تو کیا آپ خرید لیں گے؟"

"ضرور۔ آپ دکھا دیجئے۔"

میں اس گاہک کو اس خاتون کے پاس لے گیا۔ اس کے مکان پر دستک دی۔ وہ پیٹی کوٹ پہنے ہوئے باہر آئی اور بولی "کہیے کیسے تکلیف فرمائی۔"

"یہ گھڑی خریدنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ دکھانے کی زحمت گوارہ فرما سکتی ہیں؟"

"ضرور" وہ کہنے لگی "آیئے اندر تشریف لے آیئے۔"

ہم اندر چلے گئے۔ میں پہلی بار اس کمرے میں آیا تھا۔ ہمیں ایک پُرتکلف اور مکلف کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ اور اس نے کھڑے کھڑے لڑکی کو آواز دی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ خراماں خراماں اندر داخل ہوئی۔ سیاہ رنگ کی فراک کے

نیچے اس نے سفید رنگ کا فراخ پائنچوں والا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ دونوں جانب سینے کے گرد دو لمبی لمبی چوٹیاں یوں معلوم ہوتی تھیں گویا دو پہاڑوں کی دونوں جانب پانی کی دو نہریں بہہ رہی ہوں۔

"انہیں گھڑی دکھا دو اپنی۔"

اور اس ماہ پارہ نے اپنی سیمیں کلائی سامنے کر دی۔ سیمیں کلائی پر سیاہ سٹریپ سے ننھّی سی گھڑی بندھی ہوئی وہ شان پیدا کر رہی تھی کہ ہم دونوں دنگ رہ گئے۔

"قیمت؟" یہ گاہک کی آواز تھی۔

"پانچ سو روپے۔" عورت بولی اور لڑکی خاموش رہی۔

گاہک دزدیدہ نگاہوں سے دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور ان کی آنکھیں ایک ایسی زبان میں باتیں کر رہی تھیں۔ جنہیں کم از کم میں بالکل نہ سمجھ سکا۔

گاہک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ گاہک کو گھڑی کی نسبت کلائی زیادہ پسند آئی تھی۔ اس نے کہا "میں صلاح کر کے جواب دوں گا۔ گھر تو میں نے دیکھ ہی لیا ہے پھر آؤں گا۔"

ہم دونوں واپس آ گئے۔ اور اس کے بعد ——— میں اُسے متواتر گاہک بھیجتا رہا۔

ایک دن وہ نہایت مسرت سے میری دکان میں داخل ہوئی۔ آج وہ بے حد مسرور تھی۔ اور اس کا قہقہے لگانے کو جی چاہتا تھا۔ اس نے آتے ہی سات سو روپے میرے کاؤنٹر پر رکھے، اور کہنے لگی "یہ لیجئے سات سو روپے۔ پانچ سو اصل اور دو صد سود۔"

"گویا آپ سودے میں کامیاب ہو گئیں۔" میں نے دریافت کیا۔

"یہ سب آپ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔" وہ ہنس کر کہنے لگی "آپ ہمارا ہمیشہ خیال رکھا کیجئے گا۔ اور اسی طرح گاہک بھیجتے رہئے گا۔"

"لیکن اب گاہکوں کی کیا ضرورت ہے؟ گھڑی تو فروخت ہو چکی ہے۔" میں نے کہا۔

وہ ہنسی اور بولی "گھڑی ابھی تک میری لڑکی کی حسین کلائیوں کی زینت ہے۔ ہمیں ہر وقت گاہکوں کی ضرورت رہے گی۔ بھولئے نہیں۔"

اور کئی سیمیں کلائیاں اور شوخ گاہک میری آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے۔

صوفیہ سے ملاقات

فلمسٹار صوفیہ اُن ایکٹرسوں میں سے ہے جو پردۂ سیمیں پر جنّت کی حوروں سے بھی زیادہ حسین دکھائی دیتی ہے۔ اور اس سِلسلے میں میں صوفیہ کا خاص طور پر مدّاح تھا۔ میں نے اس کو جتنی بھی فلموں میں دیکھا تھا، یہ حسن و شباب کا ایک کامیاب مرقع دکھائی دیتی تھی۔ اور اکثر اوقات اس کی خوبصورتی بھی ہیروئن کو للکارتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

ایسی اداکارہ سے میں ذاتی طور پر ملنا چاہتا تھا اور اس غرض کے لئے جب میں پہلی مرتبہ صوفیہ کی جائے رہائش پر گیا تو وہ شوٹنگ پر گئی ہوئی تھی چنانچہ میں پھر وہاں گیا اور گوہر مقصود کو پا ہی لیا۔

سوفیہ خدوخال کے لحاظ سے ہندوستان کی حسین ترین ایکٹرسوں میں شمار کی جاتی ہے ۔ اور اس کا گندمی رنگ دیکھ کر مجھے پردۂ سیمیں کی سوفیہ یاد آگئی ۔ جسے دیکھ کر آنکھوں میں چکاچوند آنے لگتی ہے ۔

سوفیہ نے مجھے بتایا کہ وہ شادی شدہ ایکٹرس ہے ، اور ایک بچے کی ماں بھی ہے ۔ اُس نے مجھے اپنے لخت جگر سلیم سے ملایا ۔ اور کہنے لگی " میں اپنے شوہر کا نام بتانے سے معذور ہوں ۔ لیکن اتنا ضرور بتاؤں گی کہ وہ امیر اور مشہور تاجر تھے ۔"

صوفیہ کہنے لگی " اکثر شادی شدہ ایکٹریسیں اپنے آپ کو دوشیزہ ظاہر کرتی ہیں ۔ اور بچوں کا تو عموماً ذکر ہی نہیں کرتیں ۔ اس لحاظ سے میں ہندوستان کی پہلی ایکٹرس ہوں جو سب سے پہلے اپنے سات سالہ بچے " سلیم کا ذکر کر دیتی ہوں ۔"

صوفیہ کا خانگی نام صوفیہ سلطانہ ہے ۔ اور یہ دیوالی کی رات کو میکلوڈ روڈ لاہور کے ایک عالیشان مکان میں ۱۲ر نومبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئی ۔ دیوالی کی روشن رات کو پیدا ہونے والی اس حسینہ نے کہیں بھی روشنی کو نہیں چھوڑا ۔ روشن چہرہ ، روشن پیشانی ، روشن خدوخال اور روشن ضمیر ہونے کے علاوہ اس کا مستقبل بھی بہت روشن ہے ۔

صوفیہ نے مڈل تک تعلیم حاصل کی ۔ سکول میں ڈراموں اور کھیلوں وغیرہ سے بہت دلچسپی تھی ۔ اور ساتھ ہی فلمیں دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا ۔ ڈانس ماسٹر جی بخش نے جب اس کا میلان اس جانب دیکھا تو اس شعلۂ حسن کو پردۂ سیمیں پر لے آیا ۔ اور سب سے پہلے اس نے کاردار کی فلم " جیون " میں کام کیا ۔ بس یہی اس کے فلمی جیون کا پہلا سانس تھا ۔ اور اس کے بعد قیمت ، ناٹک اور شہرت جیسی عظیم الشان فلموں میں جلوہ گر ہو کر عالمگیر

شہرت کی مالکہ بن گئی۔

گریٹر بمبئی پکچرز کی شکتی۔ اورینٹ سانگ سٹوڈیوز کی گلشن۔ چتریا۔ اور بھگت پنڈ لیک، ساون آیا رے، بنسریا اور ناچ اس کے تازہ اور سدا بہار شاہکار ہیں۔ اب یہ بمبئی ٹاکیسز کی پروڈکشن نمبر ۴۳ کے علاوہ پنجابی فلم "ٹیار" میں نمودار ہو چکی ہے۔

صوفیہ اپنی پرائیویٹ زندگی میں نہایت ہی ملنسار خاتون ہے۔ حسن گفتار اور حسن سیرت دو ایسے حُسن اس کے حصے میں آئے ہیں جو بہت کم ایکٹرسوں کو نصیب ہوئے ہیں۔ جہاں یہ "ویمپ" کا رول خوبی سے ادا کرتی ہے، وہاں خانگی طور پر اتنی ہی شریف ہے۔

اس ایکٹرس میں بے شمار دوسری خوبیوں کے علاوہ ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ خطوں کا جواب بہت شوق سے دیتی ہے۔ اور ان خطوں کو پڑھ کر جن میں اس کے آرٹ پر گہری تنقید ہوتی ہے۔ یہ بہت خوش ہوا کرتی ہے۔ کہ ہندوستان میں بھی آرٹ کو جاننے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔

صوفیہ رقص کے فن میں بھی مہارت رکھتی ہے۔ اسے ٹینس، بیڈمنٹن۔ کارڈز اور کیرم کا بہت شوق ہے۔ ساڑھی کی بجائے شلوار قمیض کو زیادہ پسند کرتی ہے اور اکثر اوقات چوڑی دار پائجامہ بھی پہن لیتی ہے۔

اس ادا کارہ کا یہ دعویٰ ہے کہ جو شخص بھی اسے ایک بار مل لیتا ہے دوسری بار ملنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ "بہورانی" اور "مقدر" شاید اس کی تازہ ترین فلمیں ہیں:

از قلم
فلمسٹار صوفیہ

نیلو نے کمال محبت سے شنّو کی جانب دیکھ کر کہا۔ "کیا ہی اچھا ہو اگر ہماری شادی ہو جائے"۔

شنّو یہ سن کر مسکرا دی اور بولی "۔ تم نے تو گویا میرے منہ سے بات چھینی ہے۔ عرصے سے میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ واقعی تم نے یہ کہہ کر میرے ایک مسئلے کو حل کر دیا ہے"۔

"شنّو۔" نیلو اس کے قریب ہوتے ہوئے بولا "اگر تمہاری بھی یہی مرضی تھی تو تم نے آج تک مجھ سے اس بات کا ذکر کیوں نہ کیا"؟

شنّو نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "نیلو! تم جانتے ہو کہ عورت ایسی باتیں زبان پر نہیں لا سکتی۔ عورت محبت کو اشارات اور زبان حال

سے بیان کرتی ہے۔ اگر تم کبھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے تو تمہیں سب کچھ معلوم ہو جاتا۔ میری نگاہیں دل کی ترجمانی کرتیں۔ میرے اشارات محبّت کا اظہار کرتے۔ تیلو مجھے تم سے بہت محبّت ہے۔"

تیلو یہ سن کر بیقرار ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔ "شلّو! شادی انسان کی زندگی میں ایک نہائت ہی ضروری چیز ہے۔ اس کے بغیر زندگی ادھوری ہی معلوم ہوتی ہے۔"

شلّو نے بھاری جسم کو ایک جانب کرتے ہوئے کہا۔ "بیشک! تمہارا کہنا درست ہے۔ اب ہمیں اپنی زندگی کو ادھورا نہ رکھنا چاہیئے۔ سات شخص مجھ سے محبّت کر چکے ہیں۔ لیکن میں نے ان سے شادی نہیں کی۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں سات شادیاں کر چکی ہوں۔ لیکن تیلو! تم تو جانتے ہو کہ عورت کی شادی اتنی آسانی سے نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہ قانون میں نہ جکڑی جائے کسی کی بیوی ہو کر نہیں رہ سکتی۔"

تیلو جوتا اتار کر بیٹھ گیا اور بولا۔ "رنگین مزاج عورتیں قانون کو بھی توڑ سکتی ہیں ابھی کل ہی کی بات ہے کہ میری بیوی امیر باورچی کے ساتھ رفو چکر ہو گئی ہے۔"

"کیا یاداشت ہے تمہاری بھئی تیلو"۔ شلو کہنے لگی۔ "اس بات کو تو سات سال ہو گئے ہیں۔ لیکن تم کل ہی کی بات کہہ رہے ہو۔ سچ پوچھو تو میری یاداشت بہت ہی کمزور ہے۔ میں اتنا بھی نہیں جانتی کہ جن لوگوں کے ساتھ میں کئی کئی ماہ رہی ہوں ان کے نام کیا ہیں۔ گذشتہ بیس سالوں میں میں کئی لوگوں کے پاس رہ چکی ہوں۔ کئی شہروں کی سیر کی ہے۔ کئی قابل دید مقامات دیکھے ہیں۔ اور یہ تمام چیزیں میں خواب کی مانند بھول چکی ہوں۔"

تیلو نے اپنی انگلیاں شلّو کے ہاتھ کے گرد حمائل کر دیں۔ اور نہائت پیار

سے کہنے لگا۔ "پیاری شلّو۔ اب ہم شادی کر رہے ہیں۔ کیوں نہ ایک دوسرے کے اعتراض پہلے ہی استوار کر لیں۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ شادی کے بعد کن کن چیزوں کا تقاضا کرو گی؟"

شلّو نے اپنی تنگ پیشانی کو کھجلایا اور آنکھیں بند کرتے ہوئے کہنے لگی، "مجھے کسی قسم کا اعتراض نہیں ہوگا۔ میں آپ پر بوجھ نہیں بنوں گی۔ فقط اتنا چاہوں گی کہ شادی کے بعد ہم کسی جگہ مستقل طور پر رہائش اختیار کریں۔ خانہ بدوشوں جیسی زندگی سے تنگ آ چکی ہوں۔ میں تمہارے ساتھ بالکل تنہائی اور سکوت میں رہنا چاہتی ہوں"۔

نیلو چوکڑی مار کر بیٹھ گیا اور بولا۔ "خوب! تم نے بھی میرے دل کی بات کی ہے میں بھی ایسی ہی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ ایسی تنہائی اور سکوت میں انسان زندگی کا حقیقی لطف اٹھا سکتا ہے۔ تنہائی میں جذبات جوان ہوتے ہیں، اور جذبات کے جوان ہونے سے انسان اپنے آپ کو جوان محسوس کرنے لگتا ہے"۔

شلّو یہ سن کر قدرے اُداس سی ہو گئی۔ اور جب نیلو نے اداسی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگی: "نیلو! میری عمر زیادہ ہے۔ میرا رنگ بھی اب بدل چکا ہے۔ شباب کے بادل اب صاف ہو چکے ہیں حسن کے آثار بھی بقایا نہیں۔ کیا ان حالات میں مجھ سے محبّت کر سکو گے؟"

نیلو نے محبّت سے شلّو کے ہاتھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "شلّو۔ اپنے آپ کو میری آنکھوں سے دیکھو۔ تمہارے حسن پر تو کئی حسن قربان کئے جا سکتے ہیں۔ عمر نے تمہاری آنکھوں میں نئی قسم کی مستی اور کیف بھر دیا ہے۔ تمہاری آنکھیں شراب کے دو ایسے جام معلوم ہوتے ہیں جو لبالب شراب سے بھر دیئے گئے ہوں"۔

"اور پھر میرے بال بھی سفید ہو رہے ہیں"۔

"اس کا بھی غم نہ کرو۔ میرے بال بھی سفید ہوا چاہتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہم

دونوں شادی کے قابل ہیں، اور ہمارا جوڑ موزوں ہے"۔

"کیا سچ؟"

"ہاں۔ بالکل سچ"۔ تیلو نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب وقت کافی ہو چکا ہے۔ کیوں نہ کچھ کھانے کا انتظام کیا جائے"۔

"تم تو بڑے کام کے آدمی ہو تیلو"۔ شنلو کہنے لگی۔ "شاید تم ہی پہلے آدمی ہو جو میرے دل کی باتیں بتا سکتے ہو۔ میں کتنی خوش نصیب ہوں کہ تمہاری بیوی بنوں گی"۔

اتنا سن کر تیلو کو بہت مسرت ہوئی۔ کہنے لگا۔ "تم یہاں بیٹھو، میں ابھی کھانے پینے کے لئے کچھ لے کر آتا ہوں۔ دریا کے کنارے کھانے میں خوب لطف آئے گا۔ کہو۔ تم کیا کچھ کھانا پسند کرتی ہو"۔

"میاں بیوی کی پسند ایک جیسی ہوا کرتی ہے"۔ شنلو ہنس کر بولی۔ "اب ایسے سوال پوچھنے کا وقت نہیں۔ تمہاری پسند سو میری پسند"۔

اور تیلو مسکراتا ہوا چلا گیا۔ شنلو دور تک اُسے دیکھتی رہی۔

اتنے میں ایک نوجوان وہاں سے گذرا اور اسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا اور بولا "معاف کیجئے گا۔ کیا آپ کے پاس سگرٹ کے لئے ماچس ہو گی؟"

"جی ہاں" وہ نوجوان کی نگاہوں میں نگاہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ "اور ماچس کے لئے سگرٹ بھی ہو گا"۔

دونوں ہنس دیئے۔ شنلو نے سگرٹ نکالی۔ ایک نوجوان کو دی اور دوسری اپنے ہونٹوں کے ساتھ لگائی۔ اور ماچس جلا کر دونوں کو روشن کیا۔ فضا نیلگوں دھوئیں سے مکدّر ہو گئی۔

شلو نے نوجوان سے پوچھا "کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے"؟

"شادی"! نوجوان چونک پڑا۔ "ارے شادی تو ہمارے خاندان میں کسی نے بھی نہیں کی۔ کہو جو بوڑھا ابھی یہاں تھا، کون تھا تمہارا"؟

"تم نے اُسے کیسے دیکھ لیا"؟

"میں دو گھنٹے سے تمہاری باتیں سن رہا ہوں" نوجوان نے ایک لمبا کش لگاتے ہوئے کہا۔ "کیا وہ تمہارا شوہر تھا۔ کتنا بدصورت تھا وہ بڈھا"۔

"وہ میرا شوہر نہیں تھا" شلو نے کہا

"تو کون تھا"؟

"میرا نوکر تھا"۔ شلو قصہ ہی ختم کرنا چاہتی تھی "خیر یہ تو بتاؤ، کیا تم نے اپنی شادی کے متعلق کوئی پروگرام بنایا ہے"؟

"تمہیں دیکھ کر میرا ارادہ ہو گیا ہے کہ شادی کر لوں"۔ نوجوان نے شلو کو بتاتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے ڈر ہے کہ میں نے اگر کسی سے شادی کی درخواست کی تو وہ ٹھکرا نہ دے"۔

"تو کیا تمہیں کسی سے محبت ہے"؟ بوڑھی شلو نوجوان کا دل ٹٹولنے لگی۔

"ہاں! لیکن ابھی ابھی ہوئی ہے۔ صرف چند منٹ ہوئے ہیں۔ اور دل چاہتا ہے کہ ......"

اتنے میں تیلو سب کچھ لے کر آ گیا۔ اور شلو کے پاس ایک اجنبی نوجوان کو دیکھ کر کہنے لگا۔ "یہ کون ہے پیاری"؟

شلو ایک حسین نوجوان کو دیکھ کر پھسل پڑی تھی۔ اور نوجوان کا میلان دیکھ کر تو اس کی حالت بالکل ہی دگر ہو چکی تھی۔ اور اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر شادی ہی کرنی

ہے تو کیوں نہ اس نوجوان سے کی جائے۔ بوڑھے تیلو سے شادی کرنا بھی تو حماقت ہے اور اُسے اپنی حماقت پر افسوس ہونے لگا۔ سنجیدگی سے بولی: "تیلو! اب تو ہم تقریباً میاں بیوی بن چکے ہیں۔ اور شادی تو ہماری ہو ہی جائے گی۔ لیکن ایک بات ہے"

"وہ کیا"؟ تیلو نے بیقرار ہو کر کہا۔

"میں چاہتی ہوں کہ شادی سے پہلے تم وعدہ کرو کہ میری ہر ایک بات مانو گے"!

"شلو۔ میں تمہارے اشاروں پر ناچوں گا۔ آخر تم نے تیلو کو سمجھ ہی کیا رکھا ہے"۔ تیلو اپنی گری ہوئی مونچھوں کو اٹھاتے ہوئے بولا۔

"مجھے یقین نہیں آتا"۔ شلو نے کہا۔

"آزما کر دیکھ لو"۔

"اچھا"۔ شلو بولی "اگر یہی بات ہے تو میری ایک بات مانو"؟

"کیا"؟

"ایک سال کے بعد مجھ سے شادی کی درخواست کرنا"۔

"ایک سال کے بعد"؟ تیلو کانپ گیا۔

"ہاں صرف ایک سال کے بعد"۔

"آخر کیوں"؟

"بات یہ ہے"! شلو انگلیوں کو نچاتے ہوئے بولی"۔ شادی معمولی بات نہیں ہوا کرتی آئندہ زندگی کا دار و مدار شادی پر ہوا کرتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ شادی کرنے سے پہلے اطمینان سے سوچ لوں"۔

کیا سال بھر تم سوچتی ہی رہو گی"؟

"تم پھر میرے حکم کو ماننے میں لیت و لعل کر رہے ہو۔ اگر واقعی تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو ایک سال کے بعد مجھ سے درخواست کرنا۔ اور اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

"لیکن یہ نوجوان ...."

"اس کا تم فکر نہ کرو۔ تم جاؤ۔ میں اسے بھی بھیج دوں گی۔"

اور نیلو بڑبڑاتا ہوا چل دیا۔

"تو تم کس سے محبت کرتے ہو؟" شلو نے نوجوان سے پوچھا۔

"تم سے" اس نے فوراً جواب دیا۔

"تو مجھ سے شادی کر لو۔" شلو بے قرار ہو گئی۔

"شادی تو میں تم سے کرنا چاہتا ہوں" نوجوان بولا۔ "لیکن تم بوڑھی ہو اور میں نوجوان۔ اچھا۔ اب مجھے اجازت دو۔ جب میں بوڑھا ہو جاؤں گا تو پھر تمہارے پاس آؤں گا۔ اور ضرور شادی کروں گا۔ دیکھو انتظار کرنا۔ سگرٹ اور ماچس کا شکریہ۔"

اتنا کہہ کر نوجوان وہاں سے چل دیا۔ اور شلو ہاتھ ملتی رہ گئی۔ نیلو بھی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

حُسن بانو سے ملاقات

حسن بانو جہاں ایک حسین اداکارہ ہے وہاں ایک سلجھی ہوئی ادیبہ اور شاعرہ بھی ہے۔ اور جب میں نے "ایکٹریسوں کے افسانے"، مرتب کرنے کا پروگرام بنایا تو حسن بانو کا نام میں نے خاص طور پر اپنی ڈائری پر لکھا۔ اور جب بمبئی گیا تو حسن بانو کو ملنے کے لئے میں نے خاص طور پر وقت نکالا۔

حسن بانو ان دنوں مونیکا چیمبرز کی چوتھی منزل پر دس نمبر کے کمرے میں سکونت پذیر ہے۔ جب میں اس اداکارہ کو ملا تو میں اس کا نام رکھنے والے کی قابلیت کی داد دینے لگا۔ حسن بانو واقعی حسن بانو ہے اس حسینہ کی ہر ادا اور ہر اداکاری میں حسن موجود ہے حسن اداکاری، حسن سیرت اور حسن صورت تینوں

اس کے قبضہ میں ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حسن بانو سر سے پاؤں تک حسن و شباب کا مرقع معلوم ہوتی ہے۔ اسے پاؤڈر اور غازوں سے سخت نفرت ہے۔ اور اس کے باوجود اس کے رخسار اور ہونٹ یاقوت کے لئے بھی باعث رشک ہیں۔

حسن بانو ۸ فروری ۱۹۲۲ء کو سنگھا پور میں پیدا ہوئی۔ اور جب یہ جوان ہوئی تو کئی نوجوان سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کی جانب دیکھنے لگے۔ اور شاید انہی کی خاطر اس دوشیزہ نے پردۂ سیمیں پر اپنے جلووں کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ اور پہلی بار جب یہ "ڈاکو منصور" میں نمودار ہوئی تو واقعی یہ ایک قاتلہ تھی۔

اس کے بعد یہ متواتر دو سال تک واڈیا کی سٹنٹ فلموں میں ہنگامے بپا کرتی رہی۔ اور پھر آسرا، نئی روشنی، بہن، وچے اور جوانی وغیرہ میں اہم رول ادا کئے۔ ان دنوں بھی اس کی سرگرمیاں پورے جوبن پر ہیں۔ سپیا، تیلی اور بکھرے موتی میں نمودار ہو رہی ہے۔

افسوس کہ اس اداکارہ کے آرٹ کی وہ قدر نہ کی گئی جس کی کہ یہ درحقیقت حقدار ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس نے اعلان کر دیا ہے کہ "اگر ان فلموں میں بھی میرے آرٹ کو پسند نہ کیا گیا تو فلم انڈسٹری کو لات مار دوں گی۔"

حسن بانو ایک کامیاب رقاصہ بھی ہے۔ لیکن پروفیشنل ڈانسر نہیں۔ گانا بھی جانتی ہے، لیکن فلموں میں اس کے گانے عام طور پر پلے بیک ہوتے ہیں۔ رنجیت کی ایک دو فلموں میں اس نے خود بھی گانے گائے ہیں۔

درد میں اس نے چنچل لڑکی کا رول ادا کیا تھا۔ تیلی میں ایک سلجھی ہوئی رقاصہ کا رول ہے اور بکھرے موتی میں لیڈی بیرسٹر بن کر نمودار ہو رہی ہے۔

حسن بانو کو فلمی دنیا سے بہت شکوے اور شکایتیں ہیں۔ اور وہ کہتی ہے کہ "اس دُنیا میں بھی رشوتوں کا دور دورہ ہے۔ بلیک مارکیٹ کا بازار بھی گرم ہے۔ ڈائرکٹر بھی اسی ایکٹریس کو ابھارتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح سے اُنھیں رشوت دیتی ہیں۔ اور بعض اوقات ایک نئی ایکٹریس ایک ہی رات میں ہیروئن بن جاتی ہے"

گانوں کے متعلق حسن بانو نے مجھے بتایا "اس شعبے میں بھی رشوت چل رہی ہے۔ میوزک ڈائرکٹر بھی اُنہی کو گانے کا موقع دیتے ہیں جو ان کے اشاروں پر چلتی ہیں۔ میں بہت اچھا گا سکتی ہوں۔ لیکن میرے گانے پلے بیک ہوتے ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے کئی بار سٹیج پر بھی گایا ہے۔ مجھے کئی اعزاز بھی مل چکے ہیں۔ لیکن رشوت ہمارے اوصاف پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ زہرہ بائی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ایک وقت تھا کہ تمام میوزک ڈائرکٹر اسے بہترین مغنیہ کہا کرتے تھے، اور آج کہتے ہیں کہ "یہ گانا جانتی ہی نہیں" "اُما دیوی" کے گلے کا بھی طوطی بولتا تھا۔ لیکن اب اس بے چاری کا بھی وہی حشر ہے۔ یہ وہی اُما دیوی ہے جس نے درد کے کیف پرور گانے گائے تھے۔

پلے بیک کی بیماری اس قدر پھیل چکی ہے کہ ایک فلم میں ہیروئن، ہیروئن کی ماں سائڈ ہیروئن اور بعض اوقات طوائف کے گانے بھی ایک ہی پلے بیک سنگر گاتی ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر فلم انڈسٹری سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ لیکن آخر اس کا درمان بھی تو ہو"

حسن بانو ادب پرور ہے۔ ادبی رسالوں اور کتابوں کا خوب مطالعہ کرتی ہے۔ لیکن ادب میں بھی خویش پروری اور رشوت دیکھ کر اسے نفرت سی ہوتی جا رہی ہے۔ "تیا" اس کی تازہ پیش کش ہے۔

گھر میں جال

از قلم
فلمسٹار حسن بانو

ہوا کے ایک ہی جھونکے نے سامنے والی کھڑکی کھول دی۔ اور ہوا شپا شپ کمرے میں آنے لگی۔ سنیش بابو کو پہلے ہی سردی سی لگ رہی تھی۔ اور ہوا نے ایک اور ضرب لگائی۔ وہ الماری سے ہٹ کر کھڑکی بند کرنے کے لئے بڑھے۔ اور کھڑکی کو اچھی طرح سے بند کر کے پھر الماری کو جوڑنے میں محو ہو گئے۔

سنیش بابو آج واپس جا رہے تھے۔ کیونکہ یہاں بہت سردی پڑ گئی تھی۔ وہ تمام کپڑوں کو بڑی الماری میں لگا رہے تھے۔ تاکہ اگلے سال یہی چیزیں کام آ سکیں۔ انھوں نے پورے پانچ سال کے لئے بنگلہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ گرمیوں میں وہ خود یہاں آتے تھے۔ سردیوں میں بوڑھے گوتم کے حوالے کر کے آپ

نیچے چلے جاتے تھے۔

اب کے وہ دوسری بار اس بنگلے میں رہ رہے تھے۔ اور سولن میں ان کا تھا بھی دوسرا سال۔ اس سے پیشتر وہ مری جایا کرتے تھے۔ لیکن فسادات کے بعد وہاں جانا ایک خواب بن کر رہ گیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ انھوں نے پورے پانچ سال کے لئے ایک عالیشان بنگلہ کرائے پر لے لیا تھا۔

ستیش بابو کو آج سے چار سال پہلے تپ دق ہو گیا تھا۔ اور وہ متواتر گیارہ ماہ بستر پر کروٹیں بدلتے رہے تھے۔ قابل ڈاکٹر اور اچھی خوراک نے اُنھیں موت کے مُنھ سے نکال لیا تھا۔ اور اس کے بعد وہ گرمیوں کے چار پانچ مہینے پہاڑ پر گذارا کرتے تھے۔ اور ان کی بیوی وِدّیا بھی ان کے ساتھ جایا کرتی۔

اوپر والے دو خانے اچھی طرح سجا کر وہ درمیان والے خانے کی جانب متوجہ ہوئے۔ سویٹر، لانگ بوٹ، رین کوٹ اور دیگر ایسی چیزیں جھاڑ کر ایک جانب رکھ دیں اور اب ان کے ہاتھ میں برانڈی کی بوتل تھی، جسے دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے۔ ''ارے یہ بوتل آخر کھولی کس نے ہے۔ اس مرتبہ تو ہم نے استعمال تک نہیں کی؟''

وہ بوتل پکڑ کر کافی دیر تک سوچتے رہے۔ بوتل نصف کے قریب تھی۔ گویا نصف سے زیادہ کوئی پی گیا تھا۔

ستیش بابو نے بوتل زور سے میز پر رکھی اور خود بھی میز کے قریب آ گئے۔

وِدّیا ابھی بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میز پر بوتل رکھنے کی آواز سن کر جلدی سے بستر میں سے اٹھ کر اندر داخل ہوئی۔ وہ گھبرا رہی تھی۔ اس کے سنہری بال گورے گورے رخساروں پر عجیب کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ تنگ قمیض اس کے جوبن کو نمایاں کر رہی تھی۔

وہ حسن و شباب کا ایک دیدہ زیب مرقع معلوم ہوتی تھی۔ ستیش بابو کا رنگ تپ دق نے جتنا زرد کر دیا تھا۔ قدرت نے اسے اتنا ہی گورا چٹا بنایا ہوا تھا۔

جب وہ اندر داخل ہوئی تو برانڈی کی بوتل ستیش بابو کے ہاتھ میں تھی۔ جسے وہ کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر ودیا کی چیخ نکل گئی اور وہ گھبرا کر بولی۔ "اُف! آپ شراب پینے لگے ہیں"؟

ستیش بابو ہنس دیئے اور بولے۔ "نہیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

اور ودیا کہنے لگی۔ "مجھے اپنی آنکھیں تو دھوکہ نہیں دے سکتیں۔ آج آپ بوتل کھول کر پینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور دوسرے یہ بوتل آدھی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ آپ اس سے پہلے بھی پیتے رہے ہیں"۔

ستیش بابو نے بوتل کھول کر اس میں تین سفید رنگ کی گولیاں پیس کر ڈال دیں۔

ودیا یہ دیکھ کر اور بھی حیران ہوئی اور بولی۔ "آپ نے اس میں کیا ڈال دیا ہے"؟

"میں نے اس میں چوری کی سزا پیس کر ڈالی ہے۔" ستیش بابو کارک بند کرتے ہوئے کہنے لگے۔ "اس الماری سے آدھی بوتل کسی نے چرا کر پی ہے۔ اور اب مجھے یقین ہے کہ وہ چور اس مرتبہ بھی ضرور آئے گا۔ اور جونہی شراب پیئے گا فوراً سزا مل جائے گی۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ کوئی آپ کی شراب پی گیا ہے"؟ ودیا نزدیک ہو کر بولی۔

"اس میں شک کی گنجائش ہی نہیں"۔ ستیش بابو نے بوتل کو پھر الماری میں رکھ دیا اور اچانک شیشے کا ایک ننھا سا گلاس بھی ان کی نظر پڑ گیا۔ اُسے نکالتے ہوئے بولے "لو اب ایک اور شہادت مل گئی ہے۔ یہ ہمارا گلاس نہیں ہے۔ چور جلدی سے اپنا گلاس بھی یہیں بھول گیا ہے۔"

"تو گویا آپ شراب میں زہر ملا کر چور کو مارنا چاہتے ہیں؟"

"بیشک۔"

"قانون کی نگاہوں میں آپ قاتل ہوں گے۔"

"آپ نے قانون نہیں پڑھا۔ اگر کوئی چور میرے گھر میں چوری کرنے کو آتا ہے تو میں اُسے پستول کی گولی سے بھی اڑا سکتا ہوں۔"

"لیکن آپ کسی چور کو زہر سے ہلاک نہیں کر سکتے۔ ہمت ہے تو پستول لے کر چور کا انتظار کیجیے۔"

ودیا کو ستیش بابو کا یہ پروگرام بالکل پسند نہ تھا۔

"زہر بھی قانوناً جائز ہے۔ مجھے حق ہے کہ میں زہر سے چوہوں کو ہلاک کر دوں یا باولے کتے کا خاتمہ کر دوں۔" ستیش بابو نے پوری جرح شروع کر دی۔

"وکیل صاحب"۔ ودیا نے طنزاً کہا۔ "قانون بھی چوری کی سزا موت نہیں دیتا۔ آپ ایسا ہرگز نہ کیجیے۔ آپ کو ایسا کرنے کا بالکل کوئی حق نہیں ہے۔"

"آپ کو ان باتوں کی سمجھ نہیں ہے۔" ستیش بابو نے ذرا تحمل سے کہا۔ "جب اپنی جائداد اور مال و زر کی حفاظت کا مسئلہ پیش ہوتا ہے تو انسان خود قانون بناتا ہے۔"

"جائداد کی بھی ایک ہی کہی۔ چند قطرے پانی کے جائداد میں شامل نہیں ہوا کرتے ممکن ہے کہ کسی نے اپنے بیمار بچے کو بطور دوا ہی تھوڑی سی پلا دی ہو۔" ودیا اتنا کہتے ہوئے میز پر بیٹھ گئی۔

"قیمت اور مالیت کا سوال ہی نہیں ہوا کرتا۔ چوری آخر چوری ہے۔" ستیش بابو نے اس کے گھٹنوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "دو آنے چرانے والا بھی چور ہے اور بنک

میں سے لاکھوں روپے اڑا کر لے جانے والا بھی چور ہی ہے۔ دونوں کے لیۓ لفظ "چور" ہی استعمال کیا جاتا ہے۔"

اب ودیا نے آخری کوشش کرتے ہوئے کہا "آپ تمام سردیاں نیچے رہیں گے۔ ایسے خطرناک جال کو اس طرح بچھا جانا بھی تو کوئی عقلمندی نہیں ہے۔ خدانخواستہ اگر ہمیں کچھ ہو جاتا ہے اور......"

"اس بات کا فکر نہ کرو"۔ ستیش بابو کہنے لگے "۔ اس کا انتظام بھی میں کیۓ دیتا ہوں۔ اگر میں مر گیا تو اس الماری کی ساری جائداد تمہاری ہی ہو گی۔ اور یہ خطرناک جال بھی۔"

ودیا نے اب مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ستیش بابو سے اس کا جیتنا محال تھا۔ چنانچہ اس نے ارادہ کر لیا کہ جانے سے پیشتر یہ راز بوڑھے مالی کی بیوی کو ضرور بتا جائے گی۔ چنانچہ وہ مالی کی بیوی کی جانب چل دی۔ وہ باہر باغ میں رہا کرتی تھی۔

ودیا کے جانے کے بعد نہ جانے کہ ستیش بابو کے دل میں کیا سمائی وہ میدان میں سکیٹنگ کرنے لگے۔ غالباً یہ اس موسم کے لئے ان کے لیۓ آخری سکیٹنگ تھی۔

وہ سکیٹنگ کر رہے تھے کہ اتنے میں بوڑھا مالی چشمے سے پانی بھر کر لے آیا۔ ستیش بابو سکیٹنگ کرتے اپنے دھیان میں آ رہے تھے اور ادھر مالی سر پر صراحی اٹھائے نہ جانے کس خیال میں مست چلا آ رہا تھا۔ تب معلوم ہوا کہ دونوں کی ٹکر ہو گئی۔ ستیش بابو کا پاؤں پھسل گیا۔ اور وہ اوندھے منہ زمین پر گرے اور فوراً بے ہوش ہو گئے۔

مالی کی صراحی تو گر گئی۔ لیکن خود بال بال بچ گیا۔ مالک کی یہ حالت دیکھ کر اس کی حالت بھی خراب ہو گئی۔ اس نے اٹھا کر ستیش بابو کو اندر چارپائی پر لٹا دیا۔ اور انھیں

ہوش میں لانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔

مالی نے ان کے ہاتھ پاؤں سہلائے۔ سیکیسر کھول کر پاؤں سے جدا کیے۔

ستیش بابو کو کافی دیر تک ہوش نہ آئی۔ جب ذرا آنکھ کھولی تو مالی نے ان کے مُنھ سے شیشے کا ایک ننھا سا گلاس لگایا ہُوا تھا۔ جو وہ بے دِلی سے پی رہے تھے۔

اتنے میں وِدیا آ گئی۔ اور یہ حالت دیکھکر گھبرا گئی۔ بوڑھا مالی بولا: "فکر نہ کیجیے۔ پرماتما کی بڑی مہربانی ہوئی ہے کہ گھر میں برانڈی موجود تھی۔ اُنھیں ایک پیالہ برانڈی کا دے دیا گیا ہے۔ فوراً آرام آ جائے گا۔"

وِدیا نے برانڈی کا نام سنا تو اس کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اس نے سر مُنھ پیٹ لیا۔

مالی اور مالن کی سمجھ میں خاک نہ آیا کہ اب جب کہ ستیش بابو کی حالت اتنی اچھی ہو گئی ہے برانڈی پلا دی گئی ہے۔ تو یہ کیوں اس قدر نا امید ہو رہی ہیں؟"

نرگس سے ملاقات
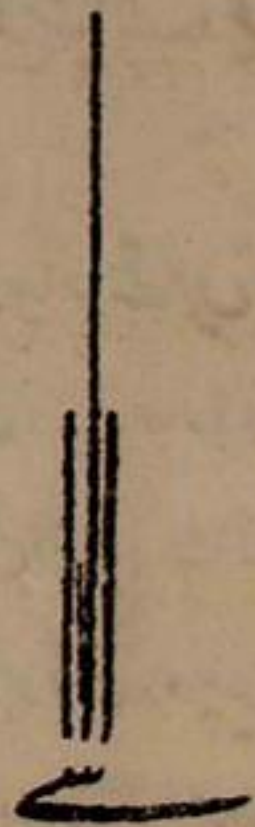
نرگس کی تعریف کرنا سورج کو روشنی دکھانے کے مترادف ہے۔ فلمی دُنیا سے دلچسپی رکھنے والا ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوگا جو نرگس کے نام سے ناواقف ہو۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو فلمی دنیا سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے وہ بھی اس حسینہ کے شیدائی ہیں۔

ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ ایک حسین دجمیل لڑکی کناٹ پلیس میں ایک درزی کی دکان میں داخل ہوئی۔ اور ٹیلر ماسٹر کو کہنے لگی "کیا آپ فلمیں دیکھا کرتے ہیں؟"

"جی ہاں!" درزی نے حیران ہو کر کہا "ان دنوں کون ایسا شخص ہوگا جو کم از کم ایک مہینے

میں ایک آدھ بار سینما ہال کا رُخ نہیں کرتا۔"

" تو کیا آپ نرگس کو پہچان لیتے ہیں"؟ وہ ذرا نزدیک ہو کر بولی۔

" یہ بھی آپ نے خوب کہی۔ اجی میری دکان میں تو بٹن لگانے والے بھی نرگس کو پہچان لیتے ہیں۔ اور تصویر میں نرگس کے ہونٹ تک دیکھ کر نرگس نرگس پکار اُٹھتے ہیں۔"

وہ ہنس دی اور کہنے لگی " آپ کونسا ٹکٹ خریدا کرتے ہیں"؟

درزی حیران ہو رہا تھا۔ لیکن ہر سوال کا جواب دیئے جا رہا تھا۔ دوکان میں کام کرنے والے تمام نوجوان کام چھوڑ کر اس گفتگو میں دلچسپی لے رہے تھے۔

" ایک روپیہ بارہ آنے کا۔ اور اگر زیادہ رش ہو تو دو روپیہ چار آنے کا۔"

اتنا سن کر اس دوشیزہ نے اپنا پرس کھولا۔ اور دو روپے چار آنے نکال کر درزی کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور بولی۔ " لیجیے آج جا کر " برسات " دیکھیے۔ اور اس میں نرگس کا وہ بلاؤز اچھی طرح دیکھ کر آیئے جو وہ آخر میں پہنتی ہے۔ اور میرے لئے بالکل ویسا ہی بلاؤز تیار کرنا ہے۔"

اتنا کہہ کر اس نے کالے رنگ کا ایک کپڑا درزی کے ہاتھ میں دے دیا۔

گویا پردۂ فلم پر نرگس کا ہر فیشن اور نرگس کی ہر ادا قدر و قیمت رکھتی ہے نوجوان لڑکیاں اس کے بالوں کی بھی نقل کرتی ہیں اور انداز کی بھی۔

یہ اداکارہ شاعر کے تصور سے بھی زیادہ حسین اور گلاب کی کلیوں سے بھی زیادہ نازک ہے۔ اور جب اپنے پورے حسن و ادا کے ساتھ پردۂ سیمیں پر جلوہ گر ہوتی ہے تو نوجوان جگر تھام کر رہ جاتے ہیں

جب پہلی بار میں نے اس دوشیزہ کو اس کے اپنے بنگلے میں دیکھا تو میں اسے پہچان بھی نہ سکا۔ جو نرگس ہم سکرین پر دیکھتے ہیں وہ گھر میں نظر نہیں آتی چھیوبرابر والی نرگس اندازاً اور برسات والی نرگس سے بھی زیادہ نازک اندام اور نازک خیال ہے، اور ساتھ ہی اتنی زندہ دل اور خوش مذاق ہے کہ جب میں نے فوٹو کھچوانے کی درخواست کی تو فوراً راضی ہو گئی۔

نرگس سنہ ۱۹۳۰ء کو بمبئی میں وہاں کی مشہور و معروف مغنیہ بائی جدن بائی کے ہاں پیدا ہوئی۔ اور موسم شباب کے شروع ہوتے ہی اس کے جوبن پر بہار چھا گئی۔ اور اس نے اداکاری اور فن کاری کا وہ معیار قائم کیا کہ فلمی دنیا بجا طور پر اس پر ناز کر سکتی ہے۔

جب یہ پہلی بار پردہ سیمیں پر آئی تو اس کی عمر آٹھ برس کے قریب تھی۔ یہ اپنے بھائی اختر کے ساتھ ایک فلم میں نمودار ہوئی جس کا نام تھا "موتی کا ہار"۔ محبوب کی "تقدیر" نے اس فلمی محبوبہ کی تقدیر کو چار چاند لگا دیئے، اور یہ فلمی دُنیا میں مثل مہتاب چمکنے لگی۔

ماں نے بیٹی کو خوب ناز و نعمت سے پالا۔ رقص و سرود اور ناز و ادا اس حسینہ کو ورثے میں ملے۔ ماں نے بیٹی کو بھی اپنے پازیب کی جھنکار سے روشناس کرایا اور بیٹی نے اپنے نغموں کو اس قدر بلند کیا کہ پازیب کی جھنکار بھی دب کر رہ گئی۔ ماں کی جھنکار اور بیٹی کی آواز نے مل کر بمبئی کی فضا کو کیف آفریں کر دیا۔

ڈائرکٹر محبوب کی فلم "ہمایوں" نے نرگس کو عروج پر پہنچا دیا۔ اور جب یہ فضلی برادرز کی "عصمت" میں نمودار ہوئی تو اس کی فن کارانہ صلاحیتیں اور بھی نمایاں ہو گئیں۔

نرگس کی مقبول تصاویر میں رامائنی، دل، جہنری، انداز، میلہ، انجمن، ردمیوجیولٹ، آگ، آج، ہلچل، دل کی آواز، اور برسات، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اور ان دنوں یہ بیک وقت کی فلموں میں جلوہ گر ہو رہی ہے۔ ایک قلیل سے عرصے میں بے شمار فلموں میں کام کر کے اس حسینہ نے ایک ریکارڈ قائم کر دکھایا ہے۔

اس کی تازہ ترین فلمیں جان پہچان، جوگن، برسات کی رات، مینا بازار، چھوٹی بھابی، آدھی رات اور پیار کی باتیں ہیں۔ اس کے علاوہ کئی نئے کانٹریکٹ ہو رہے ہیں۔

نرگس کا خانگی نام فاطمہ رشید ہے۔ سینئر کیمبرج تک تعلیم یافتہ ہے۔ یہ انگریزی فلمیں دیکھنے کی بہت دلدادہ ہے۔ سوئمنگ، بائیکنگ، رائڈنگ، اور شوٹنگ اس کے پسندیدہ مشغلے ہیں۔ اس کے علاوہ مصوری بھی اس کی بہترین ہابی ہے۔ یہ خود ہی کہا کرتی ہے کہ اگر میں ایکٹریس نہ ہوتی تو ایک کامیاب مصور ہوتی۔

نرگس بھی نگار کی مانند مرد بنتی جا رہی ہے۔ مردانہ کپڑے پہنتی ہے، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ ہمیشہ اداکار بھی اسے عوز میں نظر آتے ہیں۔ یہ ہندستان کی واحد ایکٹریس ہے جو سب سے زیادہ روپیہ کما رہی ہے۔ جن فلموں میں نرگس نے حسن و شباب کا زیادہ مظاہرہ کیا ہے ان میں اس کی نئی فلمیں ہلچل، پیار، آوارہ، ساحل، دیدار، خزانہ، جوش، چٹان، تنکے اور طوفان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

میرے عاشق

از قلم
فلمسٹار نرگس

محبّت کی ہر منزل اپنے اندر ایک افسانہ رکھتی ہے، اور ایکٹریس کی زندگی میں جہاں محبّت کی یہ منزلیں رنگین ہوتی چلی جاتی ہیں وہاں ان افسانوں میں بھی رومان اور رنگینی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ عام دوشیزہ اور ایکٹریس کی زندگی کی راہیں مختلف ہی نہیں، بلکہ بالکل الگ تھلگ ہیں۔ عام دوشیزہ کی داستانِ محبّت حقیقت کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ اور ایکٹریس کی محبّت حقیقت سے کوسوں دُور ہونے کے باوجود حقیقت کے بالکل نزدیک نظر آتی ہے اور بعض اوقات یہ اس قدر ساتھ مل جاتی ہے۔ کہ اصل اور نقل

کا فرق بھی معلوم نہیں ہوتا۔

اور اب مجھ سے سوال کیا گیا ہے کہ میں اپنے عاشقوں کا ذکر کروں۔

لیجئے اب مذکورہ کسوٹی کو پھر باہر نکالیئے۔ دیکھئے میں ایکٹریس ہوں، میری زندگی کی ہر کروٹ حقیقت سے دور اور روشنی کے نزدیک ہوگی۔ میری محبت پردۂ سیمیں تک ہی محدود ہوگی۔ اور میرے عاشق بھی موتی لال سے لے کر راج کپور تک ہی محدود ہوں گے۔ اور "ملا کی دوڑ مسجد تک" کے مصداق ہماری رومانگاہ بھی نگار خانہ کی حسین وادی ہوگی۔ اور وہاں میں حقیقت تو کیا بناوٹ بھی مصنوعی ہوگی۔ گویا ہماری ہر حقیقت افسانے سے دلچسپ اور ہر افسانہ حقیقت سے دُور نظر آئے گا۔

محبت ایک نہایت ہی مقدس اور پاک جذبہ ہے۔ محبت کا راگ آبشاروں کے ترنم سے بھی زیادہ مسحور کُن اور آبِ بہشت سے بھی زیادہ شفاف ہوتا ہے لیکن اداکاروں کی فلمی محبت میں نہ تو آبشاروں کے ترنم کی حسین صدا شامل ہوتی ہے اور نہ ہی آبِ حیات کی پاکیزگی۔ اس محبت کا ہر زاویہ ہدایت کار کی نگاہوں سے بنتا ہے۔ اور جذبات کا اظہار بھی ہدایت کار کے اشاروں پر کیا جاتا ہے۔ دُنیا والے محبت کا کھیل لوگوں سے چھُپ کر کھیلتے ہیں۔ لیکن فلمی دُنیا کی محبت ہزاروں قمقموں کی روشنی کے سائے میں کی جاتی ہے۔ اور جب فلمی عاشق مرتا ہے تو بھی اپنے کردار میں جان ڈال دیتا ہے۔

"حقیقت کا میں تم سے آج تو اظہار کرتی ہوں" لیکن یاد رہے کہ اس حقیقت کا مقصد حقیقی حقیقت نہیں ہے اور محبت بھی وہ پاک محبت نہیں ہے جو دو معصوم دلوں میں پرورش پاتی ہے۔ بلکہ یہ وہی محبت اور حقیقت ہے جس کا

اظہار فلمی ادیب کے لکھے ہوئے جملوں سے یا شاعر کے پروئے ہوئے نغموں سے کیا جاتا ہے۔ میں مجبوب اور حقیقت کا تذکرہ کر رہی ہوں۔ اور میرے عاشق بھی اسی منزل کی جانب بڑھنے والے ایک درجن ایسے راہی ہیں جنھیں ہدایت کار نے میرے عشق میں دیدہ و دانستہ مبتلا کر دیا ہے۔

موتی لال

سُنا تھا کہ "محبت کی پہلی دھڑکن فہم و فراست اور عقل و حواس کا آخری سانس ہوا کرتی ہے"۔ لیکن میرے معاملے میں منکرین کا یہ قول غلط ثابت ہوا ہے۔

عشق و محبت کی رنگینیاں دیکھئے کہ محبوب صاحب نے مجھے "بوڑھا موتی لال" پیش کر کے میری "تقدیر" بنائی۔ اور اس طرح میں نے سٹوڈیو کی تیز و تند روشنی کے سامنے اپنا پہلا عاشق تسلیم کیا۔ اور اس بوڑھے کے ساتھ میں اپنے آپ کو بوڑھا تصور کرنے لگی۔

اگر مجھے موتی لال سے محبت ہوتی تو میں اس فن کار کو دس برس قبل ملتی۔ جب یہ پردۂ سیمیں کا حسین ترین ہیرو تھا۔ جب کہ اس کی ہر ادا نوجوان دوشیزاؤں کے دلوں میں گدگدی پیدا کرتی تھی۔ اور اس کی ایک نگاہِ غلط انداز بھی حسین و جمیل لڑکیوں کو اس کے قدموں میں لا کر گرا دیتی تھی۔ تقدیر میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ موتی اپنی گذشتہ چمک کی ایک داستان بن کر رہ گیا ہے۔

بایں ہمہ موتی لال بے شمار خوبیوں کا مالک ہے۔ اس کے لبوں پہ ہر وقت ایک حسین اور جوان مسکراہٹ رقص کرتی رہتی ہے۔ حاضر جوابی کا یہ عالم ہے کہ اچھے

اچھے چرب زبان چوکڑیاں بھول جاتے ہیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ موتی لال
جتنا پرانا ہے اُتنی ہی نئی ایکٹریسوں کے مقابل ہیرو کا پارٹ کرتا ہے۔

اشوک کمار

ایک فلمی نقّاد نے لکھا تھا کہ "محبت اور پریم کے معاملے میں اشوک کمار اہنسا
کا داعی ہے" اور غالباً سادہ لوح اشوک کمار کی اس سے زیادہ خوش اسلوبی
سے تعریف نہیں کی جا سکتی اشوک کمار ایک معصوم عاشق ہے جو اپنے دل میں
جذبات ہونے کے باوجود ان کا اظہار نہیں کر سکتا۔ کم از کم "ہمایوں" میں مجھے ایسا ہی
محسوس ہُوا تھا کہ وہ ایک نادان عاشق ہے۔ اب "آدھی رات" اور "بہانہ" میں اس
عاشق کا طریق کار دیکھ کر مجھے اپنی رائے بدلنا پڑے گی یا نہیں۔ اس سوال کا جواب
اشوک کمار ہی دے سکتا ہے۔

پہاڑی سانیال

میرے عاشقوں کی فہرست میں تیسرا نمبر پہاڑی سانیال کا ہے، لیکن یاد رہے
کہ یہ تیسرے درجے کا عاشق نہیں، اس سے محبت کرنا یوں ہے جیسے کسی دیوی یا
دیوتا کے سامنے پریم کا گیت گانا۔ یہ بیچارہ بہت بھولا بھالا عاشق ہے۔ جس میں
پریم کی پوترتا تو ہو سکتی ہے لیکن عشق کی آگ نہیں ہے۔ اور یہ آگ جلانے سے
جلتی بھی تو نہیں۔ کیوں نہ یہ صاحب آرام کریں اور عشق کے دیوتا کو پرنام کر
کے ایک جانب سو جائیں۔

رحمان

میں نرگس ہوں اور رحمان نے "نرگس" ہی میں میرے ساتھ عشق لڑایا ہے
اگر سچ پوچھو تو یہ شخص بطور عاشق میری نگاہوں میں بالکل نہیں جچا۔ ذرا خیال
فرمائیے جسے آنکھیں نہ چاہیں گی دل کیسے چاہے گا۔ "رومال" میں بھی اس نے
عاشق بننے کی کوشش کی ہے لیکن بیکار۔ اس کی محبّت اور محبّت کا اظہار ایسا
ہوتا ہے کہ بس توبہ ہی بھلی۔ جب جملے بولتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ماسٹر جی کو
سبق سنا رہا ہے۔

سپرو

یہ ہے میرا رومیو جس نے مجھے جولیٹ بنایا۔ وہی نیلی نیلی اور خوفناک آنکھوں
والا۔ جس کی آنکھیں شعلے برساتی ہیں بھلا ان آنکھوں سے محبّت جیسے لطیف
چشمے کیسے پھوٹ سکتے ہیں؟ مجھے اس شخص کو دیکھ کر ڈر لگ جاتا ہے۔ ویسے تو
یہ اچھا خاصا اور گورا چٹا ہے، خوبرو بھی ہے اور بلند قامت بھی۔ لیکن ایک اچھا عاشق
ہونے کی خوبیاں اس میں مفقود ہیں۔ اور اس میں ایک ایسی کمی ہے جو میں آج
تک محسوس نہیں کر سکی۔

کرن دیوان

ایک دوشیزہ کا حجاب اور ایک حسینہ کی نزاکت مل کر کرن دیوان کا نام

اختیار کر لیتے ہیں۔ مجھے تو اس لڑکی پر بھی رحم آتا ہے جسے کرن دیوان سے محبت کرنا پڑی ہو۔ یہ عاشق نازک اندام بھی ہے اور نازک خیال بھی۔ اس عورت نما مرد کے ساتھ کم از کم مجھ جیسی لڑکی تو عشق نہیں کر سکتی۔ ورنہ دیکھا جائے تو یہ حسین اداکار خوش اخلاق انسان بھی ہے اور خوش پوش دوست بھی۔

جے راج

چوڑے چوڑے شانوں والا یہ ہیرو ایک بہادر سپاہی معلوم ہوتا ہے۔ مجھے "انجمن" میں اس سے عشق بازی کا موقعہ ملا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ یہ کامیاب عاشق نہیں بن سکتا۔ کیونکہ یہ ایک شریف آدمی ہے۔ میرے خیال میں اگر یہ اداکار ہونے کے بجائے فلاسفر ہوتا تو زیادہ کامیاب رہتا۔ یہ ہر چیز کو فلسفے کی نظر سے دیکھتا ہے۔ فلسفہ فلسفہ ہے اور عشق عشق۔ یہ دونوں کبھی ملے میں نہ ملیں گے۔

ساہو مودک

یہ ایک پر اسرار عاشق ہے۔ نہ تو اسے میں آج تک سمجھ سکی ہوں اور نہ ہی اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے خد و خال عورتوں جیسے ہیں اور سرسری طور پر اسے مرد کہہ دینا دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔

ساہو ہر لحاظ سے ایک نرالا عاشق ہے۔ رفتار اور گفتار ہر اعتبار سے یہ عدیم النظیر انسان ہے۔ اس کی الفت کا طریقہ بھی مجھ جیسی لڑکیوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ میں اسے بھائی کہا کرتی ہوں۔

ترلوک کپور

ترلوک کپور ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جس نے پردہ سیمیں پر
عشق کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ یہ ایک آئینہ دل شخص ہے۔ اس کی باتوں میں دیگر
اداکاروں کی مانند الجھنیں اور پیچیدگیاں نہیں ہوتیں۔ بلکہ اس کی زبان پر وہی
بات آتی ہے جو اس کے دل کے گوشوں سے ٹکرا رہی ہو۔ اس اداکار کو بناوٹ اور
تصنع سے نفرت ہے۔ اس کے ہر قول کے ساتھ سوجھ بوجھ اور اخلاقی رکھ رکھاؤ
کی چاشنی موجود ہوتی ہے۔

شیام

یہ جتنا بلند قامت ہے باتیں بھی اتنی ہی لمبی چوڑی کرتا ہے۔ اس کے ساتھ
محبت کرنا کسی ہوائی جہاز یا گھنٹہ گھر سے محبت کرنے کے مترادف ہے۔ "مینا بازار" میں
مجھے اس کی محبوبہ کا پارٹ دیا گیا ہے، اور مجھے یقین ہے کہ اس فلم میں اس گھنٹہ گھر
کی عشقیہ داستان سننے اور اس سے اُلفت کی سرگوشیاں کرنے کے لئے مجھے تین ایڑی
والے سینڈلوں کی ضرورت محسوس ہوگی۔

دلیپ کمار

پردے کی دنیا کا یہ ماہر فن کار اور ڈرامائی آرٹ کا مشتاق نوجوان روائتی عاشقوں
کی مکمل اور کامیاب تصویر ہے۔ اسے ایک قابل رشک عاشق کی مانند اس کے ذرہ صفات

اور حسن و نزاکت میں تمام لوازمات موجود ہیں۔ جو ایک نوجوان پریمی میں ہونے چاہئیں۔ اس کی کشادہ پیشانی پر چند بیقرار زلفیں اس کے دل کی بے قراری کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اس کی رومان پسندی کا عکس در و دیوار کو بھی رومان پرور کر دیتا ہے۔ اور اس کی رنگین طبیعت ہی عاشق کے لئے باعث تسکین ہوا کرتی ہے۔ اور اس کی محبت گلاب کے پھولوں، چاندنی رات کے حسین سائے اور شیریں سپنوں سے بھی زیادہ کیف آفریں اور کیف زا ہے۔ لیکن ہے مختصر۔ شیریں سپنے سے بھی زیادہ مختصر

راج کپور

یہ نوجوان سرتاپا شعریت سے معمور ہے۔ اس کی ادائیں شاعروں کی سی۔ ترنم شاعروں جیسا اور بالوں کی بے ترتیبی بھی شاعروں جیسی ہے۔ اس کی نیلی آنکھوں میں ایک ایسی کشش اور طاقت ہے جسے صرف دیکھنے والا ہی محسوس کر سکتا ہے یا اس کی صحیح کسوٹی ایک حسین و جمیل لڑکی کی آنکھیں ہو سکتی ہیں۔ جب اس کی آنکھوں سے آنکھیں ٹکراتی ہیں تو دل سینے سے نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے، اور ساتھ ہی دل کی تمام کیفیتوں کا علم ہو جاتا ہے۔ گویا اس شاعر دل اور انوکھے نوجوان کی آنکھیں دل کی ترجمانی بھی کرتی ہیں کہ حسن کی پہرہ داری بھی۔

راج کو اپنے جذبات کا اظہار کرنے میں ملکہ حاصل ہے۔ یہ ہر رنگ میں ڈھل جاتا ہے۔ اور اپنے ناکام عاشق کی رہنمائی اس خوش اسلوبی سے کرتا ہے کہ بذلہ سنجی اور عشق بازی شیر و شکر نظر آتے ہیں۔ اس میں مبالغے کا ذرہ بھی دخل نہیں ہے کہ جب کوئی دوشیزہ تنہائی میں راج کپور کا تصور کرتی ہے تو اس کے دل کے تار جھنجھنا اٹھتے

ہیں اور دھڑکنیں ایک دم تیز ہو جاتی ہیں۔

تمام دنیا ایک عاشق سے محبت کرتی ہے۔ اپنا تو یہ خیال ہے کہ اگر راج عاشق نہ ہوتا تو حسن و عشق کی دنیا میں کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا۔

ہاں تو یہ ہیں میرے ایک درجن فلمی عشاق جنھیں عشق کی آخری منزل اور فلم کی آخری ریل میں کامیابی ہوتی ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ میں اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں ہوں کہ ان میں سے اکثر کی جیبوں میں دودھ پلانے والی بوتلیں موجود ہیں۔

بیسویں صدی کی محبت تو ویسے ہی انوکھی اور اچھوتی ہے۔ لیکن فلم نگری کی محبت تو اپنی مثال خود ہی ہے۔ دیکھئے اس نگری میں میری کیا حالت ہے ایسے عاشقوں کے پھندے میں پھنسی ہوئی ہوں، جنھیں عورت کہہ دینا بھی کسی پر ظلم ہے۔

اس پر طرہ یہ کہ ایں حضرت فلمی دنیا کے عشق کی سول ایجنسی لئے بیٹھے ہیں!!

ایکٹریس کی ڈائری

تعارف

از قلم
خوشباش بی۔ اے

معصوم بچے آگ کی چمک اور کوئلے کی دمک دیکھ کر پکڑنے کی ضرور کوشش کرتے ہیں وہ انجام سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ بہت سوں کے ہاتھ جل چکے ہیں، اور کتنی ہی معصوم جانیں اس کھیل کی نذر ہو چکی ہیں۔ اس کے باوجود یہ کھیل جاری ہے۔

ہماری فلمی دنیا کا بھی یہی حال ہے۔ اس کی چمک دمک نے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہی ہے۔ اور وہ فلمی دنیا کی طرف بالکل اسی طرح لپک رہے ہیں، جس طرح معصوم بچے آگ کی جانب۔ بہت سے نوجوان اسی خواہش

کے زیر اثر نہ گھر کے رہے ہیں نہ گھاٹ کے۔ اور بہت سی دوشیزائیں پردۂ سیمیں کی رنگینیاں اور دلفریبیاں دیکھ کر اس جانب لپک پڑیں۔ انھوں نے اس پردے کی خاطر اپنے چہروں تک کا پردہ اتار پھینکا۔ انھوں نے اس رنگینی کی خاطر اپنی جوانی تک کو داؤں پر لگا دیا۔ انھوں نے اپنے حسن تک کو فروخت کر کے اس حسین وادی میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ اور نتیجے کے طور پر یا تو ان کی زندگی زندہ درگور بن کر رہ گئی یا وہ زندگی میں کسی کو منھ دکھانے کے بھی قابل نہیں رہیں۔ حسن تو پہلے ہی فروخت ہو چکا تھا جوانی بھی خاک میں مل گئی اور جوانی کی رعنائیاں بھی۔ گوہر عصمت بھی مٹ گیا اور گوہر الفت بھی۔ رہ کیا گیا؟ بدنامی۔ بدصورتی اور بدکاری۔

"ایکٹریس کی ڈائری" ایک ایسی ہی آپ بیتی کی آئینہ دار ہے۔ یہ ایک ایسی ہی حسین و جمیل دوشیزہ کا قصہ ہے جو پردے سے نکل کر پردۂ سیمیں کی جانب بھاگی اور بقول شخصے "نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم"۔

یہ ڈائری ہمیں کہاں سے ملی ہے؟ یہ ایک راز ہے۔ اور یہ کس ایکٹریس کی ڈائری ہے یہ اس سے بھی بڑا راز ہے۔ جسے نہ ہم افشا کر سکتے ہیں اور نہ آپ کو بتانا چاہتے ہیں جو ہم اس بارے سے باخبر ہیں یہ ڈائری جہاں فلمی دنیا کا ایک تاریک پہلو پیش کرتی ہے وہاں آپ کو فلمسازی کے حیرت انگیز راز بھی بتاتی ہے۔ مثلاً گانے کیسے بھرے جاتے ہیں۔ فلم بندی کیسے کی جاتی ہے میک اپ کیا چیز ہے۔ شوٹنگ کس طرح کی جاتی ہے اور ایک عام فلم کتنے عرصے میں تیار ہوتی ہے۔

کتاب کی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہوئے ہم اس ایکٹریس کو فلمسٹار گل اندام کا نام دیتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ یہ نام بالکل فرضی ہے۔

ایکٹریس کی ڈائری

از قلم
فلم سٹار گل اندام

۱۵ ستمبر ۱۹۴۳ء

رات کو بارہ بجے جب میں "......" نام کی ایک فلم دیکھ کر آئی، تو میرے دل میں طرح طرح کی رعنائیاں چٹکیاں لینے لگیں۔ بار بار ہیروئن کی شوخ و شنگ ادائیں میری آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگیں "ہیرو" کے ساتھ اس کے راز و نیاز اور ناز و انداز کا خیال کرتے ہی میرے جسم میں برقی لہریں پیدا ہونے لگیں اور میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "کاش! کہ میں بھی ایکٹریس بن سکتی"۔

میں سوچنے لگی، کتنی کیف افزا زندگی ہے ان اداکاروں کی۔ کتنی رنگین فضاؤں میں زندگی بسر کرتے ہیں یہ لوگ۔ ان کا لباس، ان کا معیار اور سامانِ عیش و عشرت بڑے بڑے شہزادوں کو بھی میسّر نہیں۔ بنگلوں اور کوٹھیوں میں رہنے والے امیرزادے اور امیرزادیاں بھی انھیں رشک کی نظروں سے دیکھا کرتے ہیں۔

اور یہ فلمی تیتریاں ——؟

جب گلستانِ فلم میں اپنے دلکش اور جاذب نظر پروں کے ساتھ پھولوں کا طواف کرتی ہیں، تو پھول بھی ان کے حسن و شباب کی تاب نہ لا کر شرم سے پانی پانی ہو جاتے ہیں۔ یہ ہر پھول سے لطف اندوز ہو سکتی ہیں، لیکن کوئی پھول بھی ان کی رضامندی کے بغیر ان پر نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈال سکتا۔ بلکہ ان کی نازبرداریاں کی جاتی ہیں۔ قدموں پر آنکھیں بچھائی جاتی ہیں، اور ان کی ہر خواہش کو پورا کیا جاتا ہے۔ نہ جانے دنیا کے بیوقوف لوگ "فردوسِ فلم" کے ہوتے ہوئے اس نامعلوم "بہشت" کی آرزو کیوں رکھتے ہیں؟

میں کافی رات گئے تک انہی تیاحی گلزاروں کی چہل قدمی کرتی رہی۔ اور آخر میں نے یہ مصمّم ارادہ کر لیا کہ میں بھی ایکٹرس بنوں گی۔ اور زندگی کے باقی دن عزت اور شہرت کے بچھونوں پر بسر کروں گی۔ پردۂ سیمیں پر نمودار ہو کر لوگوں سے خراجِ تحسین وصول کروں گی۔

اب میں موقع کا انتظار کرنے لگی۔ کہ ایک دن اپنے والدین پر اپنی دلی مراد کو کھول کر رکھ دوں۔ اور ان سے جانے کی اجازت طلب کروں —— اُسی حسین وادی کی جانب۔

۳؍ اکتوبر ۱۹۴۳ء

میری سولھویں سالگرہ تھی۔ ہمارے مکان کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ میری سہیلیاں اور رشتہ دار مجھے تحفے پر تحفے پیش کر رہے تھے۔ میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی آدم قد آئینہ بھی آج معمول سے زیادہ شفاف تھا۔ جونہی اس میں میں نے اپنا سرو جیسا قد دیکھا تو میں دنگ رہ گئی۔ میرے رخساروں کا پاوڈر اور لبوں کی سُرخی آج ادھی شان پیدا کر رہے تھے، ماتھے کی بندی تو غضب ڈھا رہی تھی۔ میں نے اپنے کانوں کا عکس بھی آئینہ میں دیکھا دراز جھمکے شانوں سے چھوتے ہوئے جو فضا پیدا کر رہے تھے اس کا ذکر کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ میں نے آپے سے باہر ہو کر ایک انگڑائی لی۔ ہاتھوں کے پیچھے جانے کی وجہ سے سینے میں غیر معمولی تناؤ پیدا ہو گیا۔ اور مجھے اپنا پُر شباب سینہ دیکھ کر کئی ایکٹرسوں کے سینوں کا خیال آ گیا۔ لیکن کسی میں بھی اتنا جوش شباب نہ تھا۔

اب میں دوسرے رُخ کھڑی ہو گئی۔ کمر تک لٹکتی ہوئی عنبریں چوٹی افریقہ کے سیاہ ناگ کی مانند لہرانے لگی، اور میں قدرتی طور پر اپنے پر شباب اور بے حجاب سڈول بدن پر غرور کرنے لگی۔ اور اب مجھے اپنے آپ کا معائنہ کرنے کے بعد مکمل یقین ہو گیا۔ آج تک فلمی دنیا میں کوئی ایسی حسین و جمیل لڑکی نہیں ہے۔

اتنے میں میرے ابا جان تشریف لے آئے اور آتے ہی بولے "سالگرہ مبارک ہو جانِ پدر! کہو کونسا تحفہ چاہیئے؟"

"کوئی بھی نہیں" میں نے منھ بناتے ہوئے کہا۔

میں ہی ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اور مجھے وہ بہت چاہتے تھے۔ میرا اترا ہوا مُنھ دیکھ

کر وہ بے قرار ہو گئے اور بولے "کہو پیاری بیٹا بات کیا ہے۔ آج تم اداس کیوں ہو! تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے آج تمہاری سالگرہ ہے۔ اور تم نے یوں تیوری چڑھا رکھی ہے۔ آخر تم چاہتی کیا ہو۔ میں تمہاری ہر ایک بات ماننے کے لیے تیار ہوں"۔

"کیا سچ"۔ میں نے مچل کر کہا۔

"بالکل سچ۔ میں اپنی پیاری بچی کی خاطر زندگی تک قربان کر دوں گا"۔

میری نا امیدی کے پودے پر امید کا پانی چڑھ گیا۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ بس اب دل کی مراد بر آئی۔ چنانچہ میں نے خاص انداز سے کہا۔ "میں ایکٹریس بننا چاہتی ہوں۔ کیا آپ مجھے سینما میں کام کرنے کی اجازت نہیں دیں گے"؟

میرا خیال غلط نکلا۔ یہ الفاظ سنتے ہی ان کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ اور قہر آلود آواز میں بولے "ہوش کی دوا کرو۔ کیا کہہ رہی ہو۔ جانتی ہو۔ فلموں میں کام کرنے والے کس چال چلن کے مالک ہوتے ہیں۔ جانتی ہو کہ یہ بستی کتنے گناہوں سے بھری ہوئی ہے۔ بھلا اس دنیا میں شریفوں کا کیا کام ہے۔ یہ تو ایک کوئلے کی کان کے برابر ہے۔ جو کوئی بھی اس کان میں جاتا ہے۔ کوئلہ بن کر رہ جاتا ہے۔ خبردار اب اس بات کا ذکر بھی کیا تو۔ تم ایک باعزت اور ممتاز گھرانے کی چشم و چراغ ہو۔ کیا ایکٹریس بن کر تمام خاندان کو بدنام کرنا چاہتی ہو۔ نکال دو اس منحوس خواہش کو اپنے دل سے۔ اگر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ابا جان نے بری طرح اس عظیم الشان بستی کو کوسنا شروع کر دیا۔ اور یہاں تک بھی کہہ دیا کہ "اگر تم نے پھر ایکٹریس بننے کا نام لیا تو وہ کروں گا کہ عمر بھر نہ بھولے گی"۔

آج پہلی دفعہ ابا جان اتنی ترشی سے میرے ساتھ پیش آئے تھے۔

۱۰ر اکتوبر ۱۹۴۳ء

شام کے وقت امّی جان کچھ لینے کے لئے میرے کمرے میں آئیں تو میں نے فوراً ریڈیو بند کر دیا۔ اور باتوں ہی باتوں میں ان سے بھی یہ الفاظ کہہ ڈالے کہ "میں فلموں میں کام کرنے کی خواہشمند ہوں۔ اور ضرور ایکٹریس بن کر رہوں گی"۔

انہوں نے بھی میری سخت مخالفت کی اور کہنے لگیں "نادان لڑکی کیوں دیوانی ہوئی جاتی ہو۔ بھلا ہمارے خاندان میں کس نے یہ کام کیا ہے جو تم کرنا چاہتی ہو۔ جانتی ہو اپنے باپ کا غصہ۔ اگر تم نے کوئی بات بھی ان کی مرضی کے خلاف کی تو جیتے جی منہ نہ لگائیں گے"۔

"لیکن امّی جان فلم نگری ترقی کا زینہ ہے یہ وہ سیڑھی ہے جو وقار اور آبرو کے خزانے تک جاتی ہے۔ آپ مجھے کیوں اس سیڑھی پر چڑھنے سے روکتی ہیں؟"

"بیٹی یہ سیڑھی جیسی کہ تم دیکھ رہی ہو، در اصل ویسی نہیں ہے، اس کا ایک ایک پایہ فرسودہ اور خطرناک ہے۔ اس سے گرا ہوا انسان پھر ہرگز سنبھل نہیں سکتا۔ انسان ایسا کام کرے ہی کیوں جس میں آخر کو پچھتانا پڑے"۔ ع

"چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی"

"امّی جان، کیا آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ سمندر میں جانے کے بغیر غوطہ خور موتی حاصل نہیں کر سکتا۔ پہاڑ کے اندر جانے کے بغیر سونا نہیں مل سکتا۔ اسی طرح عزت اور ناموری حاصل کرنے کے لئے اس خطرناک سیڑھی پر چڑھنا ہی پڑے گا"۔

"احمق لڑکی۔ کیا ہمارے ہاں عزت کی کمی ہے۔ کیا یہاں دولت نہیں ہے۔ کیا تمہیں یہاں کسی قسم کا دُکھ ہوتا ہے۔ میں یہ پوچھتی ہوں کہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے پرندے

کو چھوڑ کر دوسرے کے پیچھے جانا کہاں کی عقلمندی ہے"؟

اب تو میرے دل کے ارمان دل ہی دل میں رہتے نظر آنے لگے۔ ماں نے بھی مجھے غیر متوقع جواب دیا۔ لیکن میں نے یہ بات پلے باندھلی کہ اگر مجھے یہ صلح وصفائی سے نہیں جانے دیتے تو میں زبردستی چلی جاؤں گی۔ گھر سے فرار ہو جاؤں گی۔ پھر دیکھوں گی کہ کون میرے راستے میں روڑا اٹکائے گا۔ کون مجھے ڈھونڈے گا؟"

اب میں اس تاک میں رہنے لگی کہ کب سب کی نظروں میں دھول ڈال کر بھاگ نکلوں اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہو۔

۱۴ اکتوبر سنہ ۱۹۴۳ء

امی جان اور ابا جان کسی رشتہ دار کی عیادت کے لئے گئے ہوئے تھے۔ ایک نوکر ان کے ساتھ تھا، اور دوسرا چھٹی پر تھا۔ ڈرائیور ماموں جان کو چھوڑنے کے لیے گاؤں گیا ہوا تھا۔ یعنی میں گھر میں بالکل اکیلی تھی۔

میں نے موقع غنیمت سمجھا۔ اور والد صاحب کی الماری سے سیف کی چابیاں نکال کر دو ہزار کے کرنسی نوٹ قابو میں کئے۔ اور اپنے اٹیچی کیس میں چند بہترین ساڑھیاں اور قیمتی جمپر ڈال کر تیار ہو گئی۔ ساڑھے دس بج چکے تھے۔ بمبئی ایکسپریس گیارہ بجے جاتی تھی۔ چنانچہ میں نے جلدی سے ایک کاغذ پر یہ حروف لکھے۔

ابا جان۔ آداب!

سیمیں دنیا سے کافی اُنس ہے۔ آپ سے ایکٹریس بننے کی اجازت طلب کی، آپ نے خوب ڈانٹ بتائی۔ امی جان سے بھی التجا کی۔ انہوں نے بھی ایک نہ سنی۔ اب مجبوراً بھاگ

کر جا رہی ہوں یہی ایک راستہ ہے۔ امید ہے آپ معاف فرمائیں گے۔ امی جان کو میرا سلام کہئے گا۔ اچھا خدا حافظ۔

آپ کی بیٹی ــــــــ"

اس رقعہ کو بند کر کے والد صاحب کی میز پر رکھ دیا۔ اور خود مکان کو بند کر کے ٹانگے پر سوار ہو کر اسٹیشن پہنچی۔ اور جاتے ہی بمبئی کا ٹکٹ لے کر بمبے ایکسپریس پر سوار ہو گئی۔ گاڑی چھک چھک کرتے چلدی۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۴۳ء

جب سے میں بمبئی آئی ہوں "جاوید منزل" ہی میں مقیم ہوں۔ یہ ایک ایسا شاندار طرز کا ہوٹل نما مکان بنا ہوا ہے جس میں اس وقت پچاس کے قریب آدمی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس بلڈنگ کی ڈیوڑھی پر ایک بڑا سا سیاہ رنگ کا بلیک بورڈ لگا ہوا ہے جس پر تمام لوگوں کے نام اور کمروں کے نمبر درج ہیں۔

یہاں میں نے اپنا نام بھی غلط لکھوایا ہے۔ نو نمبر کے کمرے کے سامنے "ــــــــ" لکھا ہوا ہے۔ ایسا نام اس لئے لکھا گیا ہے تاکہ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی ہو سکے۔ اور کوئی شخص بھی آسانی سے یہ معلوم نہ کر سکے کہ میں ہندو ہوں یا مسلمان؟

"جاوید منزل" کے متصل ہی ایک ہوٹل ہے۔ میں اس میں کھانا کھا رہی ہوں۔ اگرچہ کھانا اتنا اچھا نہیں ہوتا جیسا کہ گھر کا ہوا کرتا تھا! پھر بھی اس پر خوش ہوں۔ کیونکہ جلد ہی میری قسمت میں ایک انقلاب رونما ہونے والا ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ بڑے بڑے ڈائرکٹر مجھے اپنی فلموں میں بطور ہیروئین کام کرنے کی پرزور دعوتیں دیں گے۔

۲۳ر اکتوبر ۱۹۴۳ء

علی الصباح ہی اخبار میں یہ اشتہار پڑھا۔

"ــــــ" پروڈکشنز کی تیسری فلم کے لئے ہیروئن کی ضرورت"۔

ڈائرکٹر صاحب سے خود ملاقات کیجئے"۔

"بمبئی ۲۲ر اکتوبر آج صبح کی گاڑی سے اس نگارخانے کے قابلِ فخر ڈائرکٹر مسٹر "ــــــ" دہلی میں اپنی دوسری تصویر کا پریس شو دینے کے بعد واپس آگئے ہیں جیسا کہ اڈیٹروں کے قیافہ سے ظاہر ہے۔ یہ فلم بھی این حضرت کی اولین پیشکش کی مانند سال رواں کی بہترین رومانی فلم تصور کی جائے گی۔ اب انہیں اپنی تیسری فلم کے لئے ایک حسین و جمیل "ہیروئن" کی ضرورت ہے۔ ضرورت مند دوشیزائیں دو بجے سے چار بجے تک سٹوڈیو میں تشریف لاکر ڈائرکٹر صاحب سے ملاقات کریں۔ تمام شرائط موقع پر ہی طے کی جائیں گی۔

المشتہر ــــــ پروڈیوسر ــــــ پروڈکشنز دادر بمبئی نمبر ۱۴۔

یہ پڑھتے ہی میں مسرت سے باغ باغ ہوگئی۔ اور اگلے دن ڈائرکٹر صاحب کو ملنے کی ٹھان لی۔

۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۳ء

اپنی بہترین ساڑھی اور دلفریب جمپر زیب تن کئے میں ڈائرکٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک خوبصورت نوجوان نیلے رنگ کا سوٹ پہنے بڑی شان سے کرسی پر

بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک چمکدار آفس ٹیبل بچھا تھا۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی بن کر آیا ہے۔ ننھا سا کمرہ تصویروں سے اٹا پڑا تھا۔ ہندوستان کی مشہور و معروف فلمسٹاروں کے دلکش پوز اس کمرے میں موجود تھے۔

ڈائرکٹر صاحب مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ اور کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "آئیے تشریف رکھئے"۔ میں آہستہ سے "شکریہ" کہہ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور وہ صاحب میرا معائنہ کرنے لگے۔ انہوں نے آن کی آن میں مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ ڈالا اور چہرے پر زرا سی قسم کی سنجیدگی ظاہر کرتے ہوئے بولے۔

"فرمائیے کیسے تشریف آوری کی؟"

"آپ کا اشتہار پڑھ کر آئی ہوں"۔

"تو خوب آپ ایکٹریس بننا چاہتی ہیں۔ اور ہماری فلم میں ہیروئن بننے کی غرض سے آرہی ہیں"۔ وہ میز پر قلم رکھتے ہوئے بولے۔

"جی ہاں"۔

"کیا آپ نے پہلے بھی کبھی اداکاری کی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ کیا آپ نے زمانۂ تعلیم میں کبھی کسی ڈرامہ میں پارٹ ادا کیا ہے"؟

"جی ہاں۔ ہمارے اسکول میں وار فنڈ کے سلسلہ میں ایک ڈرامہ ہوا تھا۔ اس میں میں نے "ہیرو" کا پارٹ ادا کیا تھا"

"ہیرو کا"؟ انھوں نے تعجب سے پوچھا۔

"جی ہاں ہیرو کا۔ کیونکہ اس ڈرامہ میں صرف لڑکیوں ہی نے حصہ لیا تھا۔ اور ہم نے ڈرامہ سے سات ہزار کی تھیلی وار فنڈ کے لئے مقامی آفیسر کو پیش کی تھی"۔

"خیر یہ چیز کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ اچھا تو آپ کا نام"؟

اس کے جواب میں میں وہی نام بتا دیا جو کہ میں نے "جاوید منزل" کے رجسٹر اور بورڈ میں درج کر دیا تھا۔

اُنھوں نے میرے نام کو دہرایا۔ اور بولے "نام تو خوب ہے۔ اچھا اگر تکلیف نہ ہو تو ستائیس تاریخ کو میری کوٹھی پر تشریف لائیے گا۔ میں ہر ممکن طریقے سے آپ کی مدد کروں گا"

"آپ کی کوٹھی پر"؟

"جی ہاں۔ یہ ہے میرا ایڈریس"۔ کہتے ہوئے اُنھوں نے میز پر سے ایک سنہری کارڈ اٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اور پھر بولے "آپ اس پتہ پر آنے کی کوشش کریں"۔

"شکریہ" میں نے کارڈ سنبھالا اور باہر نکل آئی۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۴۳ء

معمولی سی کوشش کے بعد میں نے ڈائرکٹر صاحب کی کوٹھی کا پتہ معلوم کر ہی لیا اور وہاں پہنچ گئی۔ آج ڈائرکٹر صاحب بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ اور مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ کمرہ کیا تھا ننھی سی بہشت کا ایک نمونہ تھا۔ فرش پر ایک بیش بہا قالین بچھا تھا۔ جس پر پاؤں خود بخود پھسلا جاتا تھا۔ سامنے کی دیوار پر ایک خوب لمبا چوڑا آئینہ لگا تھا۔ اور باقی کی دیواروں پر بڑے خوشنما رنگوں سے پرستان اور حورستان کے نظارے بنے ہوئے تھے۔ پریاں اپنے زرق لباس میں تالاب کی جانب جا رہی تھیں۔ اور اُدھر سورج کی کرنیں ان کے رُخ روشن پر پڑ کر اور ہی نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ کمرے کے قلب میں ایک ننھا سا میز رکھا تھا جس پر پھولدان پڑا تھا۔ نہ جانے

وہ پھول کیسے تھے، کمرہ معطر بنا ہوا تھا۔ اِدھر اُدھر دو خوبصورت صوفہ سیٹ بچھے تھے۔ ہر ایک صوفے کے پاس ایک ننھی سی تپائی پر مغربی ساخت کے سگریٹ کیس رکھے تھے۔ ماچس بھی ساتھ پڑی تھی، اور ایش ٹرے بھی ساتھ ہی رکھی تھی۔

مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا۔ اور وہ بھی میرے ساتھ دوسرے کوچ پر بیٹھ گئے۔ اور وہیں لگے ہوئے ایک بٹن کو دبایا۔ فوراً ایک نوکر آ گیا۔ اور بولا "جی حضور"!

"چائے کا انتظام کرو۔" اُنھوں نے رعب سے کہا۔

بات کرنے کی دیر میں ایک سنگِ مرمر کے میز پر چائے آ گئی۔ میز پر پیالیاں وغیرہ رکھی تھیں۔ اور ایسے چل رہا تھا جیسے بچہ گاڑیاں چلا کرتی ہیں۔ یہ چیز میں نے پہلی بار دیکھی تھی

اُنھوں نے خود چائے تیار کی۔ اور مجھے اپنے ہاتھ سے دیتے ہوئے بولے۔ "نوش فرمائیے۔" میں نے چائے لے لی۔ کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ ان کی طرزِ گفتگو اور اندازِ بیان نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ اور میں فوراً سمجھ گئی کہ یہ بڑے پاکیزہ چال چلن اور اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں۔

"آپ کہاں قیام پذیر ہیں"؟ اُنھوں نے پوچھا۔

"جاوید منزل میں"۔

"وہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے یہیں تشریف لے آئیے۔ اوپر کی منزل کے دو کمرے آپ کو خالی کرا دوں گا"۔

"آپ کی ذرہ نوازی"۔

"ابھی نوکر کو ساتھ لے جا کر سامان وغیرہ اکٹھا کر لے آئیے۔ آپ کے آنے تک میں کمرے خالی کرا دوں گا"۔

"بہت خوب"۔

چنانچہ جب میں واپس آئی تو دو کمرے میرے لئے خالی کروا دیئے گئے تھے

"آج نیچے کے کمرے ہی میں رہیئے۔ کل تک ان کمروں کو آراستہ کروا دیا جائے گا"

میں خوش تھی۔

۲۸؍ اکتوبر ۱۹۴۳ء

صبح کو جب میں بیدار ہوئی تو اوپر کے دونوں کمرے بالکل تیار کر دیئے گئے تھے۔ ایک کمرے کے سامنے کالے رنگ کے سائن بورڈ پر لکھا تھا "سونے کا کمرہ" "SLEEPING ROOM" اور دوسرے پر درج تھا "ڈریسنگ روم" "DRESSING ROOM"

سونے والا کمرہ ساڑھے چار گز لمبا اور تین گز چوڑا تھا۔ اس کے داخل ہونے والے دروازے کے سامنے ایک چوکور قسم کی کارنس بنی ہوئی تھی۔ جس کے اوپر ایک شاندار کارنس پوش بچھا ہوا تھا۔ دونوں کونوں پر خوبصورت پھولدان رکھے تھے۔ اور درمیان میں دو انگریزی طرز کے فوٹو فریم رکھے تھے جن میں ایک کے اندر تو ڈائرکٹر صاحب کا اپنا فوٹو تھا۔ اور دوسرے میں کمپنی کے مالک کا ایک بارعب فوٹو مڑھا ہوا تھا۔ اس کارنس کے دائیں طرف ایک خوبصورت میز پر بالکل نیا ریڈیو سیٹ رکھا تھا۔ جس کے اوپر ایک ویسٹ اینڈ کمپنی کا ٹائم پیس پڑا تھا۔ اور ساتھ ہی ایک سپرنگ دار صوفہ نما کوچ سونے کے لئے رکھا تھا۔ جس کے اوپر بیش قیمت چادر اور سرہانے رکھے تھے۔ ان کی چمک دمک سے تو ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ ابھی درزی کی دوکان سے لا کر یہاں بچھائے گئے ہیں۔

اس صوفے کے ساتھ ہی اتنی ہی لمبی اور اس سے قدرے اونچی انوکھی طرز کی پنچ سی رکھی تھی جو اوپر سے ہموار تھی جس پر ٹیبل لیمپ، پھولدان اور کیلنڈر رکھا تھا۔ نیچے ایک مختصر سا خانہ بنا ہوا تھا۔ اندر پانچ سات جدید کتابیں، ایک نوٹ بک اور قلمدان پڑا تھا۔

فرش پر کشمیری دستکاری کا ایک نمونہ قالین کی شکل میں بچھا تھا ایک میز پر ایش ٹرے اور پاس ہی تازہ اخبار پڑا تھا اور نیچے کے حصے میں چند فلمی رسائل پڑے تھے۔

صوفے کے پاؤں کی جانب ایک بڑی سی شیشے والی الماری رکھی تھی جس کے آگے اطلس کا پردہ لٹک رہا تھا۔ الماری میں ایک جانب کپڑے رکھنے کے تین خانے تھے۔ اور کپڑے ٹانگنے کے لئے چار کھونٹیاں لگی ہوئی تھیں۔

دونوں کھڑکیوں اور دروازں پر پردے لٹک رہے تھے۔ اور ہوا میں لہرا کر خوب اٹھکیلیاں کرتے تھے۔

دوسرا کمرہ دو حصوں میں مشتمل تھا۔ درمیان میں تختوں کی ایک دیوار سی حائل تھی۔ ایک طرف نظر فریب ڈرائینگ ٹیبل رکھا تھا جس کے درمیان ایک صاف آئینہ اور نچلے خانے میں ایک درجن کے قریب مختلف قسم کے عطر اور تیل رکھے تھے۔ پاس ہی ایک اور دراز تھا جس میں پاوڈر کریم، بندیا، ناخنوں کی پالش، رخساروں کی سرخی، لپ سٹک اور ایک ہینڈل والی کنگھی رکھی تھی۔ اس کے دونوں سروں پر ٹیبل لیمپ رکھے تھے۔ جن کے شیڈ نہائیت عمدہ اور خوش رنگ تھے۔

اس کے سامنے بیٹھنے کے لئے ایک کرسی پڑی تھی۔ ساتھ ردی کا ٹوکرا رکھا جاتا تھا جو صفائی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہی تھا۔ پچھلی طرف ایک پورے قد کا آئینہ بھی تھا۔

ڈریسنگ ٹیبل والے آئینے کے اندر سے دیکھ کر اپنی پشت بالکل صاف اور ٹھیک دکھائی دیتی تھی۔

کمرے کا دوسرا حصہ اس سے کچھ بڑا تھا جس میں ساز و سامان از حد صاف اور قرینے سے سجا ہوا تھا۔ سات آدمی بخوبی بیٹھ کر باتیں کر سکتے تھے۔ یہاں پر بھی ایک ریڈیو سیٹ فٹ کیا ہوا تھا۔ میز پر ایک ٹیلیفون بھی رکھا تھا۔ اور ایک الماری میں مختصر سی لائبریری بنی ہوئی تھی۔

الغرض دونوں کمروں میں آرام و آسائش کی ہر چیز مہیا تھی۔ ایک گھنٹی بھی لگی ہوئی تھی، جس کے بجانے سے نوکر فوراً حاضر ہو جاتا تھا۔ اور ہر ایک حکم بجا لانے کے لئے دست بستہ کھڑا رہتا تھا۔

اب میں نے محسوس کیا کہ دُنیا عیش کی آبادی ہے اور آرام کی وادی۔

یکم نومبر ۱۹۴۲ء

ڈائرکٹر صاحب نے میرے آرام کے لئے ہر ایک چیز مہیا کر دی۔ اور نوکروں کو حکم دے دیا کہ انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

دوپہر کے وقت وہ میرے کمرے میں آئے۔ اور بولے "جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ہماری فلم کی کہانی مکمل ہو گئی ہے، مکالمے بھی تیار ہو گئے ہیں اور سینریو وغیرہ بھی لکھ کر تیار کر لئے گئے ہیں۔ بس اب ہمیں شوٹنگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے"۔

"میں تو بالکل تیار ہوں"۔

"یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ اور آپ نے اخباروں میں بھی پڑھ لیا ہوگا کہ ہماری

دوسری فلم نے ایک ہی ہفتہ میں اپنی لاگت پوری کرلی ہے۔ اب تو پو بارہ ہیں۔ اس فلم کی مقبولیت کا اثر اب ہماری موجودہ فلم پر بھی ضرور پڑے گا۔ پروڈیوسر صاحب نے تو کہا ہے کہ اس فلم میں بھی اسی لڑکی کو "ہیروئن" بنایا جائے جو پہلی میں بنی ہے۔ لیکن میں نے ان کی بات کو ٹال دیا ہے اور انھیں یہ کہہ کر اپنی بات منوائی ہے کہ" لوگ نئے چہرے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ہمیں اس فلم میں کوئی اور کلی پیش کرنی چاہیئے"۔

"کیا آپ جانتی ہیں کہ میں نے یہ سب کچھ کیوں کیا ہے؟ صرف آپ کی خاطر میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اس فلم میں کچھ ایسے انداز سے پیش کروں کہ دنیائے فلم میں تہلکہ مچ جائے۔ اور آپ کی اداکاری کے سامنے بڑے بڑے کہنہ مشق اداکاروں کی اداکاری بھی بیکار ہو جائے"۔

"میں آپ کی از حد ممنون ہوں۔ اور شکریہ ادا کرتی ہوں"۔

"اس میں شکریے کی تو کچھ بات ہی نہیں ہے"۔ وہ منہ سے نیلگوں دھواں چھوڑتے ہوئے بولے: "میں آپ کو بام عروج تک پہنچانے کی قسم کھا چکا ہوں۔ اور تمہاری کامیابی کی خاطر اپنے تمام جوہر دکھا دوں گا۔ اور آپ کی اداکاری دیکھ کر پبلک مان جائے گی کہ اداکاری اور حسن ادا کا یہی آخری زاویہ ہے"۔

"واقعی آپ نے مجھ پر بڑے احسان کئے ہیں۔ میں کس کس احسان کا ذکر کروں۔ آپ کے احسانوں کے نیچے تو میری کمر تک دوہری ہوگئی ہے۔ کاش کہ میں آپ کے احسانوں کا بدلہ دے سکتی"۔

"آپ مجھے ناحق شرمندہ کر رہی ہیں۔ اب جانے دیجئے ان باتوں کو۔ غالباً ہم تمام ساز و سامان سے لیس ہو کر پانچ نومبر کو شوٹنگ کی خاطر کشمیر جائیں گے، اور وہاں چند

نظاروں اور باغوں کو فلمائیں گے۔ کیونکہ ہماری کہانی کا بڑا حصہ کشمیر جنت نظیر کی وادی ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ بھی جانے کی تیاریاں شروع کر دیں"

"فکر نہ کیجئے۔ میں تیار ہو جاؤں گی۔"

۳ نومبر ۱۹۴۳ء

رات کے وقت میرے دروازے پر دستک دی گئی۔ میں نے دریافت کیا "کون؟"

جواب ملا "میں ہوں۔ دروازہ کھولئے۔"

میں آواز پہچان گئی۔ یہ اس کمپنی کے مالک اور فلم کے پروڈیوسر کی آواز تھی۔ وہ اتنی رات گئے میرے پاس آئے تھے۔ میں سمجھ گئی کہ ضرور کوئی کام ہے۔ میں نے دروازہ کھول دیا' اور وہ بولے "معاف کیجئے میں آپ کو تکلیف دی ہے۔ اور آپ کے آرام میں حارج ہو رہا ہوں۔"

"یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے اس وقت "بندی" کو یاد فرمایا ہے۔ کہیے کیا حکم ہے میرے لائق۔"

"کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ کے ساتھ کتنی تنخواہ مقرر کی گئی ہے؟"

"جی ہاں۔ چار سو روپیہ ماہوار۔"

"یہ تنخواہ میں نے صرف ڈائرکٹر صاحب کے کہنے پر منظور کی ہے۔ ورنہ میں عموماً" نئی ایکٹرسوں کو زیادہ تنخواہ دیا کرتا ہوں' تاکہ وہ زیادہ محنت اور جانفشانی سے کام کریں۔ میں نے ڈائرکٹر صاحب کو ایک ہزار روپیہ تک اجازت دے دی تھی۔ لیکن اس نے خود ہی اتنی قلیل تنخواہ مقرر کر دی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ بعد میں اس کی تنخواہ میں اضافہ کر کے

اسے خوش کر دیا جائے گا۔ آج ڈائرکٹر صاحب یہاں نہیں ہیں۔ فلم ہی کے سلسلہ میں کہیں گئے ہوئے ہیں۔ سوچا کر جا کر معلوم کر آؤں کہ تنخواہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے"؛

"میری رائے کیا حیثیت رکھتی ہے"

"آپ بھول رہی ہیں۔ میں نے تو پہلے ہی دن سے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنی آئندہ فلموں میں بھی آپ ہی کو "ہیروئن" بناؤں گا۔ "تنخواہ" کی آپ ہرگز پروا نہ کریں۔ آپ جو کچھ چاہیں۔ مجھ سے حاصل کر سکتی ہیں۔ آپ کو کسی قسم کی مالی تکلیف نہیں ہوگی۔ مجھے اپنا ہی خیال کیجئے۔ میرے دل میں آپ کے لئے بڑی عزت ہے"۔ یہ کہتے ہوئے پروڈیوسر میرے پاس ہی صوفے والے صوفہ پر بیٹھ گئے۔ اور میری ران پر ہاتھ مار کر بولے "میرے روپے کو اپنا ہی سمجھیے۔ اور اگر کسی قسم کی تکلیف ہو۔ تو مجھے کہیئے اُسے رفع کر دوں گا"

میں اس کی مہربانیوں سے بہت خوش ہو گئی۔ اور مجھے اپنا مستقبل شاندار دکھائی دینے لگا۔ اُسکی ہر حرکت اور ہر ادا مجھے پسند آنے لگی۔ وہ بولے "کیا آپ کو یہاں اکیلے ڈر نہیں لگتا؟"

"ڈر کی تو کوئی بات نہیں۔ لیکن تنہائی میں جی گھبرانا تو قدرتی ہے"۔ میں نے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو میں آج آپ کے ہی پاس رہوں گا۔ اگر آپ گھبراتی تھیں تو ہمیں پہلے کہہ دیا ہوتا۔ کسی عورت کا انتظام کر دیتے"

اس بات نے تو مجھے اس کی ہمدردی کا بالکل قائل کر دیا۔ میں نے ان تمام باتوں کو اپنے فائدے کی محسوس کیا۔

وہ میرے ہی پاس سو گئے۔ یہ میرے لئے بالکل پہلا موقعہ تھا۔ ایک ہر بھی میرے

جسم میں پیدا ہوئی۔ اور مجھے ایک عجیب سا ہی لطف محسوس ہُوا جب ان کا ہاتھ میرے بدن سے چھُوا تو وہ مزہ آیا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ میں آپے سے باہر ہو گئی۔ اور ان کی خوشامد کی۔ انہوں نے میری تعریف کرنی شروع کر دی۔ اور ․ ․ ․ ․ رات بیت گئی۔"

صبح کے وقت ہم دونوں اُٹھے۔ انھوں نے ایک چیک بک میرے ہاتھ میں دے کر کہا "ان تمام چیکوں پر میرے دستخط ہوئے ہوئے ہیں۔ جب ضرورت ہو بنک سے روپیہ نکلوا لینا۔"

میں نے فرطِ مسرت سے چیک بک تھام لی۔ اور نہایت تشکرانہ نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا۔ جونہی آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرانے لگے۔ اور بولے "پرسوں تو آپ شوٹنگ پر چلی جائیں گی۔ اگر ناگوارِ خاطر نہ گزرے تو کل رات کو پھر یہاں آؤ۔"

"ضرور"۔ مجھے رات کا واقعہ یاد کر کے ایک ناقابلِ بیان خوشی اور مسرت محسوس ہوئی۔

۷ نومبر سنہ ۱۹۴۳ء

شوٹنگ شروع ہو گئی۔ شالامار باغ میں اچانک میری ملاقات "ہیرو" سے کروائی گئی اور دونوں ایک دوسرے کے تیز نگاہ کے گھائل ہو گئے۔ جونہی ڈائرکٹر صاحب ہمیں بتاتے ہم ویسے ہی کرنے لگتے۔ اور کیمرہ مین بڑی صفائی سے ہماری حرکات کو فلم بند کرتا جاتا۔ ہمیں اس دوران میں ہلکے زرد رنگ کے کپڑے پہنائے گئے تھے۔

ہمارے سامنے تھوڑی سی اونچائی پر مائیکروفون رکھا تھا جس کی مدد سے ہماری آواز بھی فلم بند ہوتی جا رہی تھی۔ ہدایت کار کے ساتھ ساتھ ساؤنڈ انجنیئر بھی دو ایک باتیں

سمجھا دیتا تھا۔ اتنے زور سے بولو۔ گردن کو ایسے کرو۔ منہ اس طرف کرو وغیرہ وغیرہ۔

کئی گھنٹے مختلف حالتوں میں ہمارے فوٹو لئے جانے کا کام جاری رہا۔ ایک ایک فوٹو کے بعد ہمارا رُخ تبدیل کیا جاتا۔ مائیکروفون کو اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر کیا جاتا۔ قمقموں کی مدد سے ہمارے چہروں پر بار بار روشنی ڈالی جاتی۔ کبھی تیز کبھی نرم۔ کبھی آگے سے کبھی پیچھے سے اور کبھی اُوپر سے۔ غرضیکہ کئی ہدائت کاروں نے ہمیں تگنی کا ناچ نچا دیا۔ اور میں تو شام کے وقت بالکل تھک سی گئی۔

یہاں سات خیمے لگائے گئے تھے جن کے اندر سونے کی کافی اچھی جگہ تیار کی گئی تھی مجھے بھی ایک نرم بستر بچھا دیا گیا۔

میں تھکی ہوئی تو تھی ہی۔ جلد ہی سو گئی۔

مجھے ایسا محسوس ہوا گویا کوئی شخص مجھے چھیڑ رہا ہے۔ میں نے آنکھ کھولی تو ایک نوجوان کو اپنے پاس ہی دوزانو پایا۔ چاند کی روشنی میں میں نے غور سے دیکھا تو یہ ڈائرکٹر صاحب تھے۔

بولے "آج تو تم نے کمال ہی کر دیا ہے۔ امید تو یہی ہے کہ یہ فلم ریکارڈ توڑ کامیابی حاصل کرے گی۔ آپ دیکھیں گی کہ میری ہدائت کاری کی بدولت آپ چوٹی کی ایکٹرس بن جائیں گی۔"

مجھے تو نام ہی کی خواہش تھی۔ اور میں چاہتی تھی کہ کب وہ دن آئے میں پردہ سیمیں پر لوگوں کے سامنے جلوہ نمائی کروں۔ ان لوگوں کی باتیں مجھے سو فیصدی سچی معلوم ہو رہی تھیں۔ اور ان کی ہر بات میرے لئے قابل برداشت اور باعث فخر تھی۔

ڈائرکٹر صاحب میرے بالکل قریب آگئے۔ اور ایسی ایسی حرکتیں کرتے رہے کہ جن کی میں اس سے پہلے عادی نہ تھی۔ لیکن میں نے اُنھیں نہ روکا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں میرے ہی فائدے کی خاطر کر رہے ہیں۔ اور مجھے ان باتوں سے دلچسپی سی ہونے لگی تھی۔ رات ایسے ہی کٹی۔ یہ میری زندگی کی سب سے مختصر رات تھی۔

۲۱ر نومبر ۱۹۴۳ء

کشمیر کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے بعد سب پارٹی کے ساتھ واپس آگئی۔ پھر وہی کمرے مجھے دے دیئے گئے۔ اور ہم دونوں مذاق تنگ کرنے میں بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

شام کو کمپنی کے مینجر صاحب میرے پاس تشریف لائے۔ اور بولے "کیسے اچھے دن تھے وہ جب ہم باغوں اور کھیتوں میں مزے سے باتیں کیا کرتے تھے۔ اور وہ کیسا دن تھا جب کہ میں نے پہلی مرتبہ دیدہ دانستہ تمہارے رخساروں کو ہاتھ لگا دیا تھا۔ کہ بالوں کو چہرے سے ہٹا دو۔ اور وہ رات کس قدر رومان انگیز تھی۔ جب کہ ڈائرکٹر صاحب اور ہیرو پہلگام گئے ہوئے تھے۔ اتنے بڑے خیمے میں ہم دونوں اکیلے تھے۔ اور سردی بڑھ رہی تھی۔ اس رات ہم دونوں کا ایک ہی کمبل کے اندر......"؟

اُس نے تمام گذشتہ باتیں شمار کرنی شروع کر دیں۔ اور ساتھ ساتھ میرے بالوں سے کھیلنے لگا۔ اور پھر یکایک بات کا رُخ بدل کر بولا:۔

"آج پروڈیوسر صاحب کو تمام حالات سے آگاہ کرنا ہے کہ وہاں کن کن لوگوں نے اچھی طرح کام کیا ہے۔ اور کن کن لوگوں نے سستی دکھائی ہے"؟

"بے شک شکائتیں کیجیئے۔ ورنہ مینجروں کا اَور کام ہی کیا ہوتا ہے۔ مفت کا رعب"۔
میں نے مُسکرا کر کہا۔

وہ بھی ہنس دیئے۔ اور میرے شانوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولے"۔ اب اجازت دیجیئے۔ پھر کبھی دیدار کی خاطر آؤں گا"۔

"بڑی خوشی سے"۔

مینجر صاحب نے شانے سے ہاتھ اس طرح اٹھایا کہ سارے بدن کو چھوتا ہُوا گذر گیا۔ اُنھوں نے محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

۱۵ر دسمبر ۱۹۴۳ء

اب میرے چند گلنے بھرے جانے تھے۔ ڈائرکٹر صاحب نے۔ ساؤنڈ انجینئر اور میوزک ڈائرکٹر کو کام شروع کرنے کا حکم دیا پہلے دن تو صرف ایک گانا ہی بھرا گیا۔ کیونکہ ڈائرکٹر صاحب کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ اور ساؤنڈ انجینئر کو ساتھ لے کر اپنی کوٹھی کی طرف چل دیئے۔

میوزک ڈائرکٹر نے باقی کے لوگوں کو بھی سٹوڈیو سے چلے جانے کا حکم دے دیا۔ اب صرف ہم دونوں ہی اتنے عظیم نگار خانے میں اکیلے تھے۔

میوزک ڈائرکٹر نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا"۔ اُس دن بھی آپ نے مجھے ترشی سے بلایا تھا۔ اور ناحق میرے ہاتھوں کو جھٹک دیا تھا۔ یاد رکھئے۔ آپ کی کامیابی کا دارومدار صرف گانوں پر ہی منحصر ہے۔ اگر" میوزک اچھا نہ ہوگا تو آپ کو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ اور یہ موسیقی کا حصّہ میرے ہاتھ میں ہے۔ اگر چاہوں تو کوئل

کی آواز کو کوّے جیسی بنا دوں۔ اور اگر چاہوں تو کوے کی آواز کو کوئل جیسی بنا ڈالوں۔ اگر آپ نے میری محبت کو ٹھکرایا تو یاد رکھیو پچھتانا پڑے گا۔ ڈائرکٹر۔ پروڈیوسر اور مینجر صاحب بے شک آپ کی امداد کر سکتے ہیں۔ لیکن میری مدد کے بغیر آپ کی کامیابی مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔"

مجھے اس منحوس کی خواہشات کو بھی پورا کرنا پڑا۔ کیونکہ میں مجبور تھی۔ سب کام تقریباً خوش انتظامی سے پایہ تکمیل کو پہنچ چکے تھے۔ اس کی بات کو رد کرنا اپنی قسمت کو مٹی میں ملانا تھا۔

۱۷ر جنوری سنہ ۱۹۴۴ء

اب مجھے ایک بڑھیا کے روپ میں پیش ہونا تھا۔ چونکہ فلم میں تمام سین لگاتار نہیں لئے جاتے۔ اس لئے یہ ڈائرکٹر کی مرضی پر منحصر ہوا کرتا ہے کہ پہلے کن کن نظاروں کو فلمایا جائے۔

ڈائرکٹر صاحب نے میک اپ ماسٹر کو حکم دیا کہ "انھیں بڑھیا بنا دو"۔ یہ سن کر وہ مجھے "میک اپ روم" میں لے گیا۔ جہاں ہر ایک الماری بیسیوں قسم کے رنگ و روغن سے سجی تھی۔ کمرے میں جگہ جگہ برش، کوچیاں۔ روئی اور ننھے ننھے برتن دکھائی دیتے تھے۔

پہلے تو میک اپ ماسٹر نے ایک خاص مصالحے سے میرا منھ خود دھویا۔ اور رخساروں کو خوب اچھی طرح رگڑا، نچوڑا اور مروڑا۔ اور پھر ہاتھ کی ہتھیلی سے ایک قسم کا تیل ملنے لگا، گویا مالش کر رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے موم کی ایک ننھی سی میرے

چہرے پر جمانی شروع کر دی۔ اور کافی کوشش کے بعد میرے چہرے کو موم اور مختلف قسم کے رنگوں سے اس قدر جھریا بنا دیا کہ آئینے میں دیکھ کر میں خود بھی دھوکا کھا گئی کہ آئینے میں یہ عکس کس کا ہے؟

اب اس نے میرے بازوؤں اور ہاتھوں کو بھی ایک طرح کی پالش کر دی۔ اور ان میں جھریاں سی نمودار ہو گئیں۔

اس کے بعد میرے سینے کی طرف متوجہ ہوا۔ اور ایک خاص قسم کی انگیا لے کر خود ان کو کس کر باندھنے لگا۔ اور ایک گھنٹہ کی مسلسل کوشش کے بعد اس نے انھیں بالکل اُسی حالت میں کر دیا جو ایک بڑھیا کی صورت میں ہوا کرتے ہیں۔ اور اس معاملہ میں وہ ڈائرکٹر، پروڈیوسر، مینجر، میوزک ڈائرکٹر اور ساؤنڈ انجنیئر سے بڑھ گیا۔

۱۹ر جنوری سنہ ۱۹۴۴ء

"ہیرو" کے ساتھ اب مجھے بھاگ کر جانا تھا۔ اگرچہ یہ سین کہانی کے شروع ہی میں ہونا تھا۔ لیکن اس کی فلمبندی اب ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس سلسلہ میں فلم کا تسلسل نہیں رکھا جاتا۔ مطلب تو یہ ہے کہ تمام سین فلمائے جائیں خواہ ترتیب وار ہوں یا بغیر ترتیب کے۔

سٹوڈیو میں ایک مصنوعی مکان بنایا گیا جو گتوں سے تیار کیا گیا تھا۔ اس کی کھڑکی کے نیچے "ہیرو" آیا۔ اور میں اُوپر سے ایک رسّی کے ذریعے نیچے اتر آئی۔ اور وہ مجھے بھگا کر لے گیا۔

"ہیرو" کے ساتھ مجھے کافی وقت اکٹھے رہنا پڑتا۔ ہم دونوں اکٹھے "ریہرسل"

کرتے۔ اور اسی طرح اظہارِ محبت کرتے جس طرح کہ تصویر میں کرنی پڑتی تھی
اس مصنوعی محبت اور پریم کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہم سچ مچ ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ اور
گھنٹوں تنہائی میں بیٹھ کر عشق کے جھولے جھولتے۔

۲۸ فروری سنہ ۱۹۴۴ء

نوجوان ہیرو میرے پاس آیا۔ دونوں نے اکھٹی چائے پی۔ اور پھر وہی عشق و محبت
کی داستانیں شروع ہو گئیں۔ اور وہ بولا۔ "سچ بتاؤ پیاری کیا واقعی تم مجھے
چاہتی ہو؟"

"میں تو اسی دن سے آپ کو چاہتی ہوں جب کہ پہلی بار ڈائرکٹر صاحب نے
ہمارا تعارف کروایا تھا"۔ میں نے کہا۔

"کیا تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو؟"

"مجھے اپنی جوانی کی قسم"۔

یہ سنتے ہی "ہیرو" نے اپنی انگوٹھی اتار کر میری انگلی میں ڈال دی اور . . . . . .
. . . . . ."

"اب تمھیں محبت کا پاس کرنا پڑے گا"۔ وہ بولا۔

"اور آپ کو بھی"۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ اور ہم دونوں دنیا و مافیہا
سے بے خبر ہو کر کسی اور ہی دنیا کی سیر کرنے لگے۔

اُس کے ساتھ رہ کر مجھے جو خوشی حاصل ہوتی اس کا ذکر زبانِ قلم بھی
بیان نہیں کر سکتی۔

۱۲ مارچ ۱۹۴۴ء

ڈائرکٹر صاحب نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ آج ہماری فلم ختم ہو کر "کمرہ تدوین" میں چلی گئی ہے۔ فلم اڈیٹر صاحب اسے مرتب کر کے جلد ہی فارغ ہو جائیں گے۔ اور بعد میں اسے دوسری مشین پر چڑھا کر درست کر لیا جائے گا۔ اب وہ دن دُور نہیں کہ آپ کی فلم لوگوں کے سامنے آ جائے۔

"کتنے دن اور لگ جائیں گے"؟

"بس ایک ماہ میں اب کام مکمل ہو جائے گا"۔

"پرماتما کرے کہ یہ ماہ جلد ختم ہو جائے"۔

"اب ہاتھی تو گذر گیا ہے۔ صرف دُم ہی تو رہ گئی ہے"

"لیکن مجھے تو یہ دُم بھی بہت لمبی دکھائی دے رہی ہے"۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

ڈائرکٹر صاحب ہنستے ہوئے بولے "انتظار بھی بُری چیز ہے"۔ اور ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل گئے۔

۱۴ اپریل ۱۹۴۴ء

مجھے پیٹ میں کچھ درد سا محسوس ہُوا۔ میں نے فوراً لیڈی ڈاکٹر کو فون کیا۔ وہ جلدی تشریف لے آئی۔ اور بولی "فرمائیے کیا تکلیف ہے"۔

"اچانک پیٹ میں درد شروع ہو گیا ہے"۔

اس نے میرے پیٹ سے کپڑا ہٹا کر اچھی طرح دیکھا۔ اور بولی۔ "کوئی بات نہیں ہے ایسے موقعوں پر درد اکثر پڑ ہی جایا کرتا ہے"۔

میں نے اس کا مطلب نہ سمجھا۔ اور دوبارہ پوچھا۔ "کب تک آرام آجائے گا؟"

"جب دو ماہ تک بچہ ہو جائے گا تو یہ تکلیف فوراً رفع ہو جائے گی"۔ اس نے کہا۔ "فی الحال ایک دوا بھجوا دیتی ہوں۔ درد کو آرام آجائے گا۔ اگر پھر پڑ جائے تو مجھے پھر اطلاع دیجئے گا"۔

بچے کا نام سنتے ہی میرا خون خشک ہو گیا۔ بچہ پیدا ہو گا۔ میں اس خیال سے بھی کانپنے لگی۔ میرا بچہ پیدا ہو گا۔ لوگ کیا خیال کریں گے۔ مجھے ضرور کوئی انتظام کرنا چاہیئے۔ ورنہ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے"۔

۲۰ اپریل ۱۹۴۴ء

میں پروفیسر صاحب کے ہاں گئی۔ اور جاتے ہی ان کے پاؤں پکڑ لئے۔ اور کہا۔ "میں جلد ہی ماں بننے والی ہوں۔ اس کے باپ آپ ہی ہیں۔ آپ مجھ سے شادی کر لیں۔ تاکہ لوگ نکتہ چینی نہ کریں"۔

"نہیں میں ہرگز ایسا نہیں کر سکتا۔ میں شادی نہیں کروں گا۔ میں نے کنوارہ رہنے کی قسم کھا رکھی ہے"۔

"یوں کیوں نہیں کہتے کہ میں نے معصوم اور بے گناہ لڑکیوں کی زندگی خراب کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ انھیں گناہ پر آمادہ کرنے کا پرن کر لیا ہے"۔

"بکواس کرنے کی ضرورت نہیں"۔ وہ بولے۔ "اگر بھلی چاہتی ہو تو یہاں سے

چلی جاؤ۔"

"کیا آپ آئندہ فلم میں ہیروئن نہیں بنائیں گے مجھے؟"

"ہیروئن بننے سے پہلے آئینہ میں اپنی شکل تو دیکھو۔ چہرے کی چھائیاں۔ صورت پر مُردنی چھائی ہوئی ہے۔ کون بے وقوف تمہیں فلم میں کام کرنے کے لئے منتخب کرے گا۔"

گویا مجھ پر پہاڑ گر پڑا ہو۔ وہاں سے میں بھاگتی ہوئی ڈائرکٹر کے پاس آگئی۔ اور اُنھیں بھی اس بات سے آگاہ کیا۔ "میں ماں بننے والی ہوں کیا آپ میرے ہونے والے بچے کے باپ بن سکتے ہیں؟"

"عقل کے ناخن لو، نادان چھوکری۔ بھلا ہمیں شادی کے بندھن میں پھنسنے سے کیا فائدہ؟

آخر میں ہیرو کے پاس گئی۔ اور مجھے یقین تھا کہ یہاں میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ لیکن جونہی اُس نے سنا کہ چند ہی دنوں میں میرا بچہ ہونے والا ہے۔ تو وہ بولا۔ "افسوس کہ فی الحال میں شادی نہیں کر سکتا۔"

میں نے بہت واسطے دیئے۔ ناک رگڑا۔ لیکن وہ نہ مانا۔ میں نے اس کی دی ہوئی انگوٹھی اُس کے ماتھے پر دے ماری۔ اور خود دیوانہ وار دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔

۲۸ مئی سنہ ۱۹۴۴ء

میرے پیٹ میں پھر کچھ تکلیف سی پیدا ہو گئی۔ اور میں نے پھر لیڈی ڈاکٹر

کو بلا بھیجا۔ وہ بولی :"اب آپ کے لئے یہی اچھا ہے کہ کسی ہسپتال میں داخل ہو جائیں۔ کیونکہ اس حالت میں جہاں بچے کی جان کا خطرہ ہے۔ وہاں آپ کی زندگی اور موت کا بھی سوال ہے"۔

"کیا آپ مجھے کسی ہسپتال میں پہنچا سکتی ہیں۔ میں آپ کی بہت ممنون ہوں گی"۔

"فکر نہ کیجئے۔ میں آپ کو ہولی فیملی ہسپتال میں داخل کروا دیتی ہوں"۔

اُسی دن میں ہسپتال میں داخل کر دی گئی۔ وہاں کے رجسٹر پر میں نے اپنے والد صاحب کا نام بھی غلط لکھایا۔ تاکہ ان کی بے عزتی نہ ہو۔

۳۱ مئی سنہ ۱۹۴۴ء

اخبار میں یہ خبر سرخیوں کے ساتھ لکھی ہوئی تھی" ——— پرو ڈکشنز کی تیسری عدیم النظیر پیشکش ——— "جس میں حسن شباب کی ملکہ ——— پہلی مرتبہ جلوہ گر ہو رہی ہے۔ یکم جون کو ——— ٹاکیز میں ملاحظہ فرمائیے"۔

میں نے ارادہ کر لیا کہ خواہ کچھ بھی ہو۔ میں کل یہ فلم ضرور دیکھوں گی۔ وہ فلم جس نے میری زندگی برباد کر دی ہے۔ وہ فلم جس کی بدولت میں ماں باپ اور دنیا والوں کی نظروں سے بھی گر گئی ہوں۔ اب پھر پیٹ میں درد محسوس ہو رہا ہے۔ خدا کرے کل شام تک آرام آ جائے تاکہ میں اپنے گناہوں کا آئینہ اور اپنی لغزشوں کی پیداوار دیکھ سکوں۔

نوٹ:- اس ڈائری کے باقی اوراق نہیں مل سکے یہ معلوم نہیں کہ اس احمق اور ناعاقبت اندیش ایکٹریس کا حشر کیا ہُوا۔ لیکن ہم اندازہ ضرور لگا سکتے ہیں۔

مریدولا سے ملاقات

"راجہ ویلا یہی ہے"۔ ایک ننھا مُنا بچہ بولا۔ "اور مریدولا بہن بھی یہیں رہتی ہیں۔ آپ پیچھے سے جائیے۔ وہ اُوپر رہتی ہیں"۔

میں سیڑھیاں طے کر کے ایک کمرے میں پہنچ گیا۔ دو حسین و جمیل لڑکیاں سویٹر بُن رہی تھیں۔ اور ساتھ ہی ہنس ہنس کر باتوں میں مصروف تھیں۔ مجھے دیکھ کر دونوں کھڑی ہو گئیں۔ اور مسکرا کر دریافت کیا" فرمائیے"؟

"مریدولا کو ملنے آیا ہوں"۔

"اندر تشریف لے جائیے"۔ ایک حسینہ نے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

میں اندر چلا گیا۔ نہایت ہی پر تکلف کمرے

ہیں۔ ایک بنگالی قسم کے صاحب نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ میں نے ابھی تک اپنا بیگ بھی اچھی طرح میز پر نہ رکھا تھا۔ کہ نوکر چائے لے کر آگیا۔ اور پھر پیسٹری، بسکٹ بھی لے آیا۔

"آپ چائے شوق فرمائیے"۔ وہ بنگالی صاحب بولے۔

"آپ تکلف کر رہے ہیں"۔ کہتے ہوئے میں نے چائے پینا شروع کر دی۔

تھوڑی دیر کے بعد نوکر پھر نمودار ہوا۔ اور مجھے کہنے لگا۔" بی بی جی فرما رہی ہیں کہ آپ دوسرے کمرے میں آجائیں"۔

میں دوسرے کمرے میں گیا تو ایک لڑکی نے کہا" ان سے ملیئے۔ یہ میری ایکٹرس سہیلی ہیں۔ اور میں آپ کی مریدولا ہوں"۔ وہ ہنس دی۔

اور میں نے کہا۔" آپ دونوں کو مل کر خوشباش کو بہت خوشی ہوئی ہے"۔

" اوہ۔ تو آپ مسٹر خوشباش ہیں۔ فلمی رنگ محل کے مصنف"۔ ایک نے اُچھل کر کہا۔ " میری خوش نصیبی ہے کہ آپ کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیوں گی"۔

اور پھر چائے کا دور شروع ہو گیا۔ بنگالی صاحب بھی شریک ہو گئے۔ اور ایک ڈانس ڈائرکٹر ڈلکشمی دھر باجپائی بھی آگئے۔

باتوں باتوں میں میں نے مریدولا کے متعلق بہت کچھ معلوم کر لیا۔ اس نے گذشتہ تین برس سے کسی بھی فلم میں کام نہیں کیا تھا۔ پہلے بے بی ہونے والی تھی۔ اور پھر "بے بی" ہو گئی۔ نہ تو بے بی سے پہلے کام کر سکی۔ نہ بعد میں۔ بلکہ خود بیمار ہو گئی۔ جونہی بیماری سے اُٹھی موٹی ہونا شروع ہو گئی۔ اور از سر نو دبلا ہونے کے لئے ڈانس سیکھنا شروع کر دیا۔ موٹاپن تو دُور نہ ہوا۔ لیکن مریدولا ڈانس ضرور سیکھ گئی۔

مرید ولا ان ایکٹریسوں میں سے ہے جن کی خانگی زندگی باعثِ رشک ہے۔ وہ بطور بیوی اور ماں زیادہ کامیاب ہے۔ اور بطور ایکٹریس کم۔

مسٹر چکرورتی اسے زبردستی فلمی دنیا میں گھسیٹ لائے۔ بمبئی ٹاکیز کی شہرت اور مسٹر رائے کے پیار نے اس کی آنکھوں میں فلمی دنیا کے لئے زیادہ کشش پیدا کر دی۔ اور وہ اس دنیا میں سانس لیتی رہی۔

مرید ولا ۳ر نومبر ۱۹۲۴ء کو المورہ میں پیدا ہوئی۔ جب ایف۔ اے میں آئی۔ تو بمبئی ٹاکیز کی گود اس کے لئے وا ہو گئی۔ اور یہ خود کہتی ہے۔ کہ اگر میں بمبئی ٹاکیز میں نہ آتی تو آج گریجویٹ ہوتی۔ ورنہ سوشل سروس کر کے ہی ڈگری حاصل کر لیتی۔

مرید ولا جوار بھاٹا۔ سماج کو بدل ڈالو۔ بھگت دھرو۔ اور ٹوٹے تارے وغیرہ کئی فلموں میں اپنی حسین اداکاری کے جوہر دکھا چکی ہے۔ اور اب سیٹھ جگت نارائن کی ایک تصویر میں نئے رنگ سے نمودار ہو رہی ہے۔ رام درشن اور دیدہ ہیر و دا مین اس کی تازہ ترین تصویریں ہیں۔

مرید ولا مسٹر جی۔ سی۔ ابینڈے کی اہلیہ محترمہ ہے۔ یہ صاحب ان دنوں اپنی ذاتی فلم کمپنی بنانے کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔

"یہ اداکارہ اردو۔ ہندی اور انگلش اچھی طرح بول چال سکتی ہے۔ لیکن اپنے دستخط عام طور پر انگریزی میں کرتی ہے۔

اس اداکارہ کے دل میں وطن کی محبت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اور اس چیز کا واحد ثبوت یہ ہے کہ اس نے کلا مندر کی تصویر "آزادی کی راہ میں مفت کام کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ لیکن پھر دنما لا سے کنٹریکٹ ہو گیا

تھا۔

فن کاروں میں اسے دیو کی بوس۔ پرتھوی راج اور کامنی کوشل پسند ہیں۔ اور یہ کہا کرتی ہے کہ ایکٹریسوں میں کامنی کوشل "دی بیسٹ" THE BEST (بہترین) ہے۔

اس اداکارہ میں حب الوطنی کے علاوہ شرافت، ہمدردی اور مہمان نوازی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ پوجا پاٹھ کے معاملے میں بہت پابند ہے۔ اس کے کمرے میں لگی ہوئی تصویریں ہی میری اس بات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

اسے تاش کھیلنے کا بہت شوق ہے۔ لیکن بدقسمتی سے میں اس کے ساتھ تاش نہ کھیل سکا۔ اور دوڑ پی کر واپس آگیا۔

از قلم
فلمسٹار مریدولا

"بھیڑیئے" لیڈی ڈاکٹر نے زور سے دانت پیس کر کہا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ تمام مرد اُسے "بھیڑیئے" دکھائی دے رہے تھے۔ بھیڑیئے سے بھی بدتر۔ آج اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ کیمپ میں بھی محفوظ نہیں۔۔ اسسٹنٹ ڈاکٹر ما کو اس سے اتنی دلچسپی کیوں تھی۔ کرنل صاحب اس پر کیوں اتنے مہربان تھے۔ وہ سمجھ رہی تھی۔ آج تمام مرد اُسے بھیڑیئے دکھائی دے رہے تھے۔ اُسے ایسا دکھائی دیا گویا بیسیوں بھیڑیئے اُس کے سامنے ننگے ناچ رہے ہوں۔ اور اپنے خوفناک دانت اور پنجے اس کی جانب پھیلائے ہوئے ہوں۔

اس سے پیشتر وہ عورتوں اور لڑکیوں کی بیماریوں کا اندازہ لگایا کرتی تھی۔ آج اس نئے وطن کے محافظوں کی فطرت دیکھ لی تھی۔ پہلے وہ سمجھا کرتی تھی کہ مرد وطن کے سچے خیر خواہ اور خیر طلب ہیں۔ لیکن آج اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ مرد ایک ایسا ذلیل اور ذلیل حیوان ہے جو جذبات کی رَو میں بہہ کر سب کچھ فراموش کر بیٹھتا ہے۔ تمام رشتوں اور واسطوں کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ اور ایسی ایسی حرکتیں کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔

وہ پھر کرسی سے اٹھی اور نرس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "اسے بھی لیبر وارڈ نمبر ۲ میں بھیج دو۔"

وارڈ ۲ میں حاملہ لڑکیاں رکھی گئی تھیں۔ برآمد کی ہوئی لڑکیوں کو ٹرانزٹ کیمپ میں بھیجنے سے پہلے میڈیکل کیمپ میں رکھا جاتا تھا۔ آزاد ہونے والی لڑکیوں کو اس کیمپ میں دلاسا دیا جاتا تھا۔ ان کی خوراک کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اور ایسی سکیم بنائی گئی تھی کہ دو ہی ماہ میں یہ لڑکیاں قید اور حراست بیجا کا تمام دکھ بھول جائیں اور پھر انہیں ٹرانزٹ کیمپ میں لے جا کر والدین کے پاس بھیج دیا جاتا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر سب کا معائنہ کرتی تھی۔ اور حاملہ لڑکیوں کو لیبر وارڈ ۲ میں اور دوشیزاؤں کو وارڈ ۳ میں بھیج دیتی تھی۔

آج سے تین ماہ پہلے ایک سو لڑکیوں کا گروہ داخل کیا گیا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر کو معائنے میں پورے پانچ دن لگے تھے۔ پچیس دوشیزائیں حاملہ تھیں۔ دس بیوائیں حاملہ تھیں۔ اور تیس لڑکیاں متعدد بیماریوں میں مبتلا تھیں۔ اور باقی کی پینتیس عورتیں اور لڑکیاں جسمانی طور پر بالکل تندرست تھیں۔ غنڈوں نے ابھی تک

انھیں ناپاک نہیں کیا تھا۔ ان کے کیریکٹر کی بلندی تک فسادیوں کی ناپاک تمنائیں نہ پہنچ سکی تھیں۔ وہ خوفزدہ تھیں۔ انھیں "بی" وارڈ میں رکھا گیا۔

اور سب کی دیکھ بھال باقاعدگی اور پروگرام کے مطابق جاری رہی۔ حاملہ لڑکیوں کا حسب ضرورت اور حسب موقع علاج کیا گیا۔ متعدی بیماریوں والی عورتوں کو بڑے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔

لیڈی ڈاکٹر خود سب کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔ حاملہ لڑکیوں کی جانب ان لوگوں کی توجہ زیادہ تھی۔ ان کا علاج بھی کیا جا رہا تھا۔ اور دل جوئی بھی، نرسیں گھنٹوں بیٹھ کر انھیں کہانیاں اور قصے سنایا کرتی تھیں۔

تین ماہ کے بعد اس گروہ کو ٹرانزٹ کیمپ میں بھیجنے کا پروگرام بنایا گیا، اور اب فیصلہ ہونے لگا کہ کن لڑکیوں کو وہاں جانے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

لیڈی ڈاکٹر پہلے کی مانند سب کا معائنہ کرنے لگی۔

پینتیس حاملہ لڑکیوں اور عورتوں میں سے ستائیس کو دوسرے کیمپ میں جانے کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ باقی آٹھ یا تو دو ایک دن میں مائیں بننے والی تھیں یا اسی ہفتہ میں مائیں بن چکی تھیں اور نقل و حرکت کے ناقابل تھیں۔

اب خوفزدہ لڑکیوں کا معائنہ ہونے لگا۔

ایک لڑکی کا کیس دیکھ کر لیڈی ڈاکٹر دنگ رہ گئی۔ وہ حیرت سے اس کا منھ تکنے لگی۔

"کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے"؟

"جی نہیں"۔

لیڈی ڈاکٹر حیران تھی۔ جب یہ لڑکی کیمپ میں لائی گئی تھی، تو اس کی صحت سب سے اچھی تھی۔ زیادہ خوفزدہ معلوم نہ ہوتی تھی۔ غنڈوں کی حراست میں اس کی صحت اور عصمت دونوں محفوظ تھیں۔

لیکن اب ——— ؟

وہ حاملہ تھی۔ لیڈی ڈاکٹر حیرت سے اس کا کیس پڑھنے لگی۔ اور پھر اُسے دیکھ کر بولی۔

"تمہاری سیاہ کاریاں ظاہر ہو چکی ہیں۔"

وہ خاموش رہی۔ کانپ رہی تھی۔ ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ اور باوجود کوشش کے بولنے سے قاصر تھی۔

لیڈی ڈاکٹر اس کے پیٹ کی طرف دیکھ کر بولی: "کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ یہ کیسے ہُوا ہے"؟

وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ اُس نے اپنے پیٹ اور سینے کو دوپٹے سے ڈھانپ کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

لیڈی ڈاکٹر کو غصہ آ گیا۔ "بولتی نہیں ہے چڑیل۔ بتا کہاں سے مُنہ کالا کروا لائی ہے شرم نہ آئی ایسی حرکت کرتے ہوئے۔ ڈوب مرے شرم چلّو بھر پانی میں۔"

وہ اب بھی خاموش تھی۔

"فوراً میری بات کا جواب دو"۔ لیڈی ڈاکٹر کہنے لگی۔ "آخر تم نے اپنے چہرے پر یہ کیوں پھینکا ہے۔ فوراً بتاؤ اس کا ذمہ دار کون ہے"؟

وہ ادھر اُدھر دیکھ کر بولی" وارڈ آفیسر"۔

"وارڈ آفیسر"؟ لیڈی ڈاکٹر دنگ رہ گئی۔

"جی ہاں"۔ وہ چشمے کی مانند پھوٹ پڑی۔ "اس ظالم نے پہلے دن ہی سے مجھ پر نگاہ بد رکھی تھی۔ اور مجھے سب سے زیادہ راشن، دودھ، کپڑا اور دیگر چیزیں دیتا رہا۔ اور ایک دن اُس نے مجھے کہا۔ جانتی ہو مجھے تم سے کتنی نسبت ہے"؟

میں نے جواب دیا۔ "ہاں"۔ اور ہاں کے ساتھ ہی ایک زور کا تھپڑ اس کے رخسار پر رسید کر دیا۔

"اچھا۔ تو اس کا بدلہ لُوں گا۔" وہ رخسار سہلاتا ہوا چلا گیا۔

اور اگلے ہی دن میرا راشن بند ہو گیا۔ متواتر تین دن اور چار راتیں مجھے راشن نہ دیا گیا۔ ایک کھیل تک اُڑ کر میرے مُنہ میں نہ گئی۔ مجھے جنرل وارڈ سے ہٹا کر علیحدہ کمرہ میں رکھ دیا گیا۔ اور چوتھے دن صبح ہی وارڈن صاحب پھر میرے کمرے میں آگئے۔ اور بولے۔ "کیا حسن کی سرکار کا غرور ابھی تک نہیں اُترا"؟

میں خاموش رہی۔ اور وہ ایک بھوکے کُتے اور خونخوار بھیڑیے کی مانند مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ میں تو پہلے ہی بے جان تھی۔ بچاؤ کرتے ہوئے بولی۔ "روٹی"۔

"اگر روٹی مل جائے تو ہمارا کام بن جائے گا"؟ اُس کے چہرے پر شیطنت ٹپک رہی تھی۔

میں نے سر ہلا کر کہا "ہاں"۔

اور نہایت ہی پر تکلف کھانا میرے لئے آگیا۔ وارڈن صاحب خود بخود میرے پاس بیٹھ کر کھانے لگے۔ اور کھانے کے بعد اُنھوں نے دروازہ بند کر لیا۔ اور میری جانب بڑھے۔ وہ میرے قریب آتے گئے۔ میرے کپڑوں کے قریب، میرے جسم کے قریب، میرے

بالوں کے قریب، رخساروں کے قریب اور یہاں تک کہ وہ میرے اتنے قریب آگئے
کہ میں بیان نہیں کرسکتی۔ جسم سے جسم ملنے لگا۔ اُس ظالم نے مجھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں
کیا کہوں، میں مجبور تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اپنے آپ کو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ مجھے کتوں کی
مانند چچوڑنے لگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ رونے لگی۔ آنسوؤں کی ندی پھوٹ نکلی۔

لیڈی ڈاکٹر کانپ اُٹھی۔ اور کیمپ کا تمام انتظام اُسے مضحکہ خیز نظر آنے لگا۔
وارڈن صاحبہ کی حرکت نے اُسے بے حس و حرکت کردیا۔ وہ غصہ میں کانپ بھی رہی
تھی۔ اور اس کے ہاتھ پاؤں بھی شل ہو رہے تھے۔

"بھیڑیئے"۔ اُس نے زور سے دانت پیس کر کہا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ بہت کچھ
کہنا چاہتی تھی۔

وہ نرس کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ "اسے بھی وارڈ "اے" میں بھیج دو"۔
اب اُسے ایسا دکھائی دیا گویا بیسیوں بھیڑیئے اس کے سامنے ننگے
ناچ رہے ہوں۔ اور اپنے خوفناک دانت اور خونی پنجے اس کی جانب پھیلائے
ہوئے ہوں۔

اُس کے دماغ نے سوچنا بند کردیا، لیکن وہ سوچتی ہی رہی نہ جانے کیا؟

منورما سے ملاقات

اس شوخ و چنچل ایکٹریس سے میں "دیپک" میں ملا۔ ۱۹۴۴ء۔ دیپک زہرہ بیگم انبالے والی کا "عشرت کدہ" ہے۔ جب چاند برق نے مجھے بتایا کہ اس کے خیال میں حسین ترین منورما ہے تو میں نے اس سے منورما کا پتہ دریافت کیا۔ خوش خلق چاند برق نے پتہ بتانے کی بجائے اپنا نوکر ہی میرے ہمراہ بھیج دیا۔

کمہار روڈ پر ایک ننھا سا بنگلہ تھا۔ منورما تو نہ ملی، البتہ اس کے شوہر راجن ہکسر سے ملاقات ہو گئی، خوبرو اداکار راجن ہکسر، جو دیکھنے میں دلیپ کمار اور دیوانند سے بھی "خوش خط" نظر آ رہا تھا۔ اس کی زبانی معلوم

ہوا کہ منورما زہرہ بیگم انبالے والی کے پاس گئی ہوئی ہے

ہاں تو وہاں گئے۔ سب سے پہلے زہرہ بیگم کے شیر نما کتوں نے استقبال کیا۔ اور پھر خوش گلو زہرہ بیگم اور خوش اخلاق منورما سے ملاقات ہوئی۔ اور بعد ازاں زہرہ بیگم کی خوش نما کار پر بیٹھ کر خوش الحان راجکماری کے ہاں گئے۔

میں نے منورما کے متعلق بہت سی باتیں معلوم کر لیں۔ اس اداکارہ کی بات بات سے شوخی اور شرارت ٹپکتی ہے۔ اور حسن اخلاق کا یہ عالم ہے کہ اس کے پہلو سے اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔

منورما ۱۴ اگست ۱۹۲۶ء کو میکلیگن کالج لاہور کے پروفیسر مسٹر ڈینیل کے ہاں پیدا ہوئی۔ اور "ایرن ڈینیل" کے نام سے ہوسٹل کی رومان گاہ میں پرورش پانے لگی۔ جوانی کے ساتھ ہی فلمی دنیا کی جانب بڑھی۔ اور چند ہی فلموں میں نمودار ہو کر نوجوانوں کے صبر و سکون میں ہلچل مچا دی۔

سب سے پہلے "ایک مسافر" میں آئی۔ اور پھر ہمت، میرا ماہی، پردیسی ڈھولا، سہتی مراد، خاندان، پونجی اور خزانچی وغیرہ کی فلموں میں غیر فانی اداکاری کے جوہر دکھائے۔

اس شوخ و شنگ ایکٹریس نے پنچھی، بھائی، چھپا اور شالیمار میں خوب کام کیا ہے۔

منورما "میک اپ" میں خوب ماہر ہے۔ اور بالوں کو بیسیوں طریقوں سے بناتی ہے۔ اس کے ناخن اور رخسار اس کی خوبصورتی میں خوب اضافہ کرتے ہیں۔ گانا جانتی ہے لیکن اس کی آواز پردہ سیمیں کے لئے ناموزوں ہے

النا صر کے ساتھ رومان لڑانے کے بعد اب جملہ حقوق راجن ہکسر کے نام محفوظ کروا دیئے ہیں۔

اس کی نئی فلموں میں الجھن - ماں کا پیار، اور پیار کی جیت کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "ہنستے آنسو" اس کی تازہ ترین پیشکش ہے۔

منورما کی ازدواجی زندگی بھی کامیاب ہے، اور معلوم ہوتا ہے۔ راجن ہکسر نے اس کے نشیب و فراز کو سمجھ لیا ہے۔ اس امر کی کامیابی کی ضمانت ایک ننھی سی بچی ہے جو دونوں کے لئے معاہدہ الفت کی حیثیت رکھتی ہے۔

منورما کو پنجابی طرزِ رہائش بہت پسند ہے جہاں وہ چوڑی دار پائجامہ پسند کرتی ہے۔ وہاں قمیض اور شلوار کی بھی بہت دلدادہ ہے۔ لیکن اس کا جوبن غرارے میں نکھرتا ہے۔ اور وہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔

اسے انگریزی فلمیں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کی اداکاری سے بھی مغربی طرزِ اداکاری کی جھلک ٹپکتی ہے۔ حال ہی میں منورما نے فلم جھریا۔ چاند ستارے۔ جلترنگ۔ آنچل اور سرتاج کے بعد وساکھی جوہری اور شان میں عالی شان کردار پیش کر کے اپنے لئے ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے۔

آنسو نہ بہا

ازقلم
فلمسٹار منورما

میرا نام اوشا ہے۔ اور در اصل میں اپنے نام سے بھی زیادہ خوبصورت تھی۔ جو کوئی بھی دیکھتا دنگ رہ جاتا۔ میرا جسم بلور کی مانند صاف اور شفاف تھا بالکل بے داغ بدن تھا میرا۔ میرا قد۔ میرا حسن۔ اور میرا نکھار دیکھنے سے ہی تعلق رکھتا تھا۔ وہ میری جوانی کا عالم تھا۔ وہ میرے شباب کا موسم تھا۔ اور اب ــــ ؟

میری تمام بہاریں خزاں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ شباب لٹ چکا ہے۔ جوانی برباد ہو چکی ہے۔ حسن بک چکا ہے۔ میں سربازار بکتی رہی ہوں۔ دلالوں نے بھی مجھ سے فائدے اٹھائے ہیں۔

جب میں اپنی گذشتہ زندگی پر نگاہ ڈالتی ہوں تو تھرا اٹھتی ہوں۔ دور رفتہ کا ایک ایک واقعہ یاد کر کے

مجھے اپنے آپ سے بھی نفرت ہونے لگتی ہے۔

اُف میں بھی کس کس کے قبضے میں رہی ؟ کس کس نے مجھے ایک بے جان کھلونے کی مانند استعمال کیا۔ اور بے ایمان بوڑھے نے تو اپنی آمدنی کا ذریعہ ہی مجھے بنا لیا۔ اور یہاں تک کہ ایک بیوہ بھی میری ہی کمائی کھانے لگی۔

جوانی ہی میں مجھے ایک سیٹھ کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ اور اس سلسلے میں میں اپنے وارثوں کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتی۔ کیوں ــــ ؟

اس لئے کہ یہی ان کا پیشہ تھا۔ اور اس سے پیشتر بھی وہ میری بہنوں سے یہی سلوک کرتے تھے۔ چیز یں بھی بک گئیں۔ محلے کی کئی لڑکیاں مجھے دیکھنے آئیں۔ سیٹھ کے نوجوان بھائی نے جب مجھے دیکھا تو دل ہی دل میں کہنے لگا۔" چیز تو بہت اچھی ہے"۔

نوجوان بھائی اپنے سینے میں نوجوان دل رکھتا تھا۔ گھر کے سب لوگ اُس سے ڈرتے تھے۔ اس کی عیاشیوں سے بھی سب واقف تھے۔ جس چیز کو وہ پسند کرتا اُسے ضرور حاصل کر کے چھوڑتا۔

اور اس نے مجھ پر نظر رکھ لی۔ ایک دن اُس نے اپنے بھائی کے سامنے اپنے دل کے دفتر کھول کر رکھ دیئے۔ اور کہنے لگا۔" بھائی صاحب! ایک بات کہوں" ؟

" ایک نہیں انیک باتیں کہو برخوردار"۔

" لیکن کہتے ہوئے شرم آتی ہے"۔ نوجوان نے اپنے بھائی کا دل ٹٹولتے ہوئے کہا۔

" ارے شرم اور تم تو دو متضاد چیزیں ہیں۔ بھلا تمہیں کیوں شرم آنے لگی"۔

" کیا آپ میرے جذبات کی قدر کریں گے" ؟

" ضرور"۔

"اوشا کو میرے حوالے کر دیجئے کیونکہ ...." نوجوان اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔ شائد اُسے محسوس ہُوا کہ بھائی سے ایسی درخواست نہیں کرنا چاہیئے تھی۔

اور جانباز بھائی نے مجھے اس کے حوالے کر دیا۔ اور میں بڑے بھائی کے گھر سے نکل کر چھوٹے بھائی کے ہاں چلی گئی۔

میں نے اپنی جوانی کی کئی راتیں اس نوجوان کے کمرے میں بسر کیں۔ رات کو جب وہ کمرے میں داخل ہوتا تو بجلی بند کر کے بستر پر دراز ہو جاتا۔ اور میں تاریکی میں اُس سے ......"

بہر حال میں متواتر ایک سال اُس کے قبضے میں رہی۔ اس نے ابھی شادی نہ کی تھی۔ اور شائد یہی وجہ تھی کہ بعض اوقات وہ مجھے دن رات استعمال کرتا رہتا تھا۔ اور اکثر کئی کئی دن میری خبر تک نہ لیتا تھا۔

اُس کی شادی ہوئی تو اُس نے مجھے اپنی بیوہ بہن کے سپرد کر دیا۔ نوجوان بہن جس نے سہاگ کا ایک سال بھی نہ دیکھا تھا۔ جس کے سہاگ کو موت کے ظالم ہاتھوں نے بڑی بے رحمی سے چھین لیا تھا۔ جس کی سیمیں کلائیاں رنگین چوڑا اتار کر ویران کر دی گئی تھیں۔ اور اب وہ بیوہ تھی۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو اس کے چہرے پر امید کی ایک شوخ سی کرن دکھائی دی۔ اور ——؟

اُس نے مجھے ہی ذریعہ معاش بنا لیا۔ اور چند ایک ایسے گاہک پیدا کیے کہ وہ جلد ہی بیسیوں روپے روز پیدا کرنے لگی۔ اور جب اُسے راتوں کا چسکا پڑا تو بس وارے نیارے ہو گئے۔ وہ اپنی بیوگی کو بھی بھول گئی۔ مجھے دن رات روندا جانے لگا۔ جب میں آرام کرتی تو شدتِ کار کی وجہ سے میرا انگ انگ درد کرنے لگتا۔

میں نے اُسے ہزاروں روپے کما کر دیئے۔ اور ایک دن ایسا آیا کہ میرا جوبن ڈھل

گیا۔ جوانی کے دن بیت گئے۔ اور وہ بھی مجھ سے اکتا گئی۔

اُس نے مجھے ایک بوڑھے درزی کے سپرد کر دیا۔ جو ویسے تو کپڑے سینے کا کام کرتا تھا

لیکن جب اُس نے مجھے حاصل کیا بلکہ خرید اتو ——— ؟

بوڑھے نے اپنی لائن بدل دی۔ درزیوں کا کام چھوڑ دیا اور میری بدولت کھانے کمانے لگا۔

ایک بار کسی کے ہاں شادی تھی۔ اس نے مجھے ایک رات کے لئے بیس روپے کے عوض

کرائے پر چڑھایا۔ وہ رات میری زندگی کی ناقابلِ فراموش رات تھی۔ کم و بیش سات نوجوانوں

نے مجھے تختۂ مشق بنایا۔ میرا انجر پنجر ڈھیلا ہو گیا۔

بوڑھے نے مجھے دن رات کرائے پر چڑھانا شروع کر دیا۔ مالِ مفت، دلِ بے رحم کے مصداق

لوگوں نے مجھے نچوڑنا اور بچوڑنا شروع کر دیا۔ آخر اس بوڑھے نے بھی ایک دلال کی معرفت، ایک ماسٹر

کے سپرد کر دیا۔ لیکن — ؟

پہلی رات ماسٹر کے ہاں چوری ہو گئی۔ اور چور مجھے بھی لے اڑے۔ اگلی صبح ماسٹر نے تھانے جا

کر رپورٹ لکھوائی کہ اُس کے ہاں بے شمار چیزیں چوری ہو گئی ہیں۔

"آپ کی سب سے زیادہ قیمتی چیز کونسی تھی" ؟ تھانیدار صاحب نے رپورٹ لکھتے ہوئے پوچھا۔

"اوشا"۔ ماسٹر نے روتے ہوئے کہا۔

"اوشا" ؟ تھانیدار صاحب دنگ رہ گئے۔

"جی ہاں۔ اُوشا۔ کپڑے سینے کی مشین"۔

تھانیدار صاحب نے مسکراتے ہوئے ماسٹر کی طرف دیکھا۔ اور کہا۔ فکر نہ کرو۔ ہم پوری

تحقیقات کریں گے۔ خدا نے چاہا تو تمہاری 'اُوشا' کا سراغ ضرور مل جائے گا"۔

اور اب میں کباڑی کی دکان میں پڑی اپنے نئے خریدار کا انتظار کر رہی ہوں ٭

تعارف

از قلم
شہاب ملیح آبادی

یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ میں جسے خود متعارف ہونے کے لئے وسیلے تلاش کرنا چاہیئے تھے، ایسے شخص کے تعارف کی ذمہ داری قبول کر رہا ہوں جسے تعارف کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ تقسیم وطن سے علم و ادب کی صفوں میں جو انتشار پیدا ہوا ہے۔ اس کا یہ بھی ایک خلل ہے۔ کہ ایک معروف شخص کا تعارف ایک غیر معروف شخص کر رہا ہے۔

حضرۃ خوشباش کو جب میں نے پہلی بار دیکھا تو وہ مجھے بالکل نظر نہیں آئے۔ عینک دیکھ کر مجھے کچھ بدگمانی بھی ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ میں نے انھیں طلوع ہوتے دیکھا۔ ہر چند دن میں

طلوع ہونے والی شخصیتوں پر آنکھ بند کر کے بھروسہ نہیں کیا جا سکتا. شخصیتوں کے اصل جوہر تو غروبِ آفتاب کے بعد ہی کھلتے ہیں تاہم بعض افراد میں ایسی بلا کی سادگی ہوتی ہے کہ بے اعتمادی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس پر بھی اگر خوشباش وہ نہ ثابت ہوں جو میں سمجھ رہا ہوں تو میرے لئے یہی سزا کافی ہے کہ خود میں سادہ لوح قرار دے دیا جاؤں۔

میں ادب میں پہلی چیز جو تلاش کرتا ہوں وہ چلبلا پن ہے۔ چلبلا پن حرکات و سکنات ہی سے ظاہر نہیں ہوتا، طرزِ بیان اور طرزِ فکر میں بھی ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ادیب کے جادۂ فکر کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں، نہیں، لیکن منزل سے پہلے رفتار کے لئے حرکت کی استعداد تو ہو۔ حضرتِ خوشباش کی تحریروں میں چلبلا پن صاف نظر آتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ ہر چلبلا شخص ادیب بھی ہو لیکن ہر ادیب چلبلا ضرور ہوتا ہے، میں خوشباش میں ادیب کی اس شان کو جلوہ گر پاتا ہوں۔

آج ادیب کے متعلق یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ وہ خلا میں فکر نہیں کرتا۔ اس کے کرۂ خیال کا محور سماجی شعور اور گرد و پیش کی دنیا ہے۔ آج کسی ادیب کی ادبی حیثیت متعین کرنے کے لئے اس چلتی پھرتی زندگی کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ جس میں ادیب سانس لیتا ہے۔ خوشباش نے لڑکپن ہی سے پر نکالنا شروع کر دیئے تھے۔ کہتے ہیں ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، اور غلط نہیں کہتے۔ کالج میں قدم رکھا تو ماہانہ "شوالہ" کے برہمن بن گئے۔ کالج کی رنگینیاں اگر غلط راہ پر پڑ جائیں ضرور رنگ لاتی ہیں۔ خوشباش کے مذاقِ سلیم نے ان کی اچھی رہنمائی کی۔ ایوننگ نیوز دہلی کے ایڈیٹر بنے۔ اس کے "حسن پرست" میں

مدعو ہوئے۔ ان دونوں پرچوں کو فلمی دنیا میں کامرانی کی منزل پر پہنچانے کا سہرا خوشباش ہی کے سر ہے۔ اس سہرے کی مہک خوشباش کی تحریروں میں آج بھی بند ہے۔

تقسیمِ وطن کا یہ بھی ایک کرشمہ ہے کہ خوشباش نے اس شہر میں قدم رکھا جو کبھی عالم میں انتخاب تھا۔ اور آج اجڑا ہوا دیار ہے۔ میری مراد دہلی سے ہے۔ روزنامہ "پرتاپ" میں فلمی صفحات ان ہی کے نگارشِ قلم کا فیض تھے۔ ۱۹۴۹ء میں خوشباش نے "فلمی رنگ محل" کتاب لکھ کر فلمی دنیا سے اپنے لوہے کو منوا لیا۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ فلم انڈیا جرنلسٹس ایسوسی ایشن نے اس کتاب کو ۱۹۴۹ء کی بہترین تصنیف تسلیم کیا۔ اور اس اعزاز میں انھیں "سکرول آف آنر" پیش کر کے بہترین فلمی نقاد قرار دیا۔

خوشباش نے فلمی دُنیا میں خاص شہرت حاصل کر لی ہے۔ فلم کی دنیا کی طرف دو قسم کے افراد قدم اٹھاتے ہیں۔ اول تو وہ منچلے نوجوان جو خود اپنے مرکب ہوتے ہیں، ان پر ان کے لاشعور کا جن سوار رہتا ہے۔ دوم وہ افراد جو مذاق ادبیانہ رکھتے ہیں اور فلم کی علمی و ادبی اہمیت تسلیم کرتے ہیں۔ ہالی وڈ کے مقابل روس کی فلمی صنعت نے ثابت کر دیا ہے کہ فلم قومی تعلیم و تربیت کا سب سے زیادہ موثر حربہ ہے۔ سن کی قید نہیں رہتی ہر کہ و مہ اس سے متاثر ہو سکتا اور ہوتا ہے۔ حضرت خوشباش ایسے ہی سنجیدہ ادیبوں میں ہیں جو فلمی صنعت کو زر و زن کی میزان میں نہیں تولتے۔ بلکہ اس کی صحیح خدمت کرنا چاہتے ہیں

خوشباش کا طرزِ تحریر اور اسلوبِ بیان شگفتگی و شیرینی کی وہ دولت رکھتا ہے جو ادب کو صحت اور ادیب کے مذاق کو جوانی بخشتی ہے۔ ان کی تحریروں میں دہلی کی مہک اور لکھنؤ کی چہک ہے۔ ان کے افسانوں میں رومان کی وادی

کی چلبلاہٹ حسین چہروں کی مسکراہٹ اور رنگین آبشاروں کی گنگناہٹ ہے۔ اُن
کے قلم میں وہ شوخی ہے جو آہو چشمان جواں سالہ کی آنکھوں اور حسینانِ سُبک رفتار
کے خرام میں ہوتی ہے۔

ع ۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

۱۷ فروری ۱۹۵۱ء

شہاب ملیح آبادی